حیاتِ اقبال

ثمرین خواجہ

دیباچہ

علامہ اقبال کی زندگی کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور جب تک دنیا میں مسلمان باقی ہیں یہ سلسلہ ختم نہیں ہوگا۔ لیکن یہ مختصر کتاب ایک خاص مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

اقبال سے صرف خواص ہی کو عقیدت نہیں تھی۔ ان کی ذات ہمیشہ عوام کی ارادت کا مرجع بھی بنی رہی ہے۔ آج ہندوستان میں لاکھوں انسان ایسے ہیں۔ جو اقبال کے متعلق بہت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ لیکن فلسفہ پر انہیں دسترس نہیں۔ فارسی زبان سے وہ بالکل نابلد ہیں۔ کانٹ برگساں اور نٹشے کے نام ان کے اپنے اندر کوئی معنی نہیں رکھتے۔ یہ کتاب اس قسم کے لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے۔

ہم نے اس کتاب میں عمداً اقبال کے فارسی اشعار نہیں دیے۔ البتہ انہوں نے اپنی فارسی کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے اس کا نہایت مجمل سا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ دقیق مباحث سے بھی احتراز کیا ہے اور سیدھی سادی زبان میں تمام ضروری مطالب بیان کر دینے کی کوشش کی ہے۔

ہمارے ملک میں سوانح نگاری کا عام انداز یہ ہے کہ کتاب کے دو حصے کر دیے ہیں۔ ایک حصے میں زندگی کے عام حالات ہوتے ہیں۔ دوسرے میں کارناموں کا تذکرہ۔ تصانیف پر تبصرہ وغیرہ۔ ہم نے یہ انداز اختیار نہیں کیا۔ بلکہ شاعر کی سوانح کے ساتھ ساتھ اس کے تخیل کے ارتقا و مختلف تصانیف کا ذکر کر دیا ہے۔

جہاں تک علامہ اقبال کی سوانح کا تعلق ہے اس کتاب میں کافی تفصیلات مہیا کر دی گئی ہیں اور اس وقت تک مرحوم کے متعلق جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جس میں اس قدر تفصیل مل سکے۔

عنایت اللہ

شیخ عنایت اللہ مینجر تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور 1936ء میں جب یورپ سے واپس آئے تو حضرت علامہ اقبال نے آپ کو جو خط بھیجا وہ درج ذیل ہے۔

جناب شیخ صاحب السلام علیکم۔

یورپ سے مع الخیری بر آنے مبارک۔

میں تمام دن گھر پر ہوتا ہوں آج جس وقت چاہیں تشریف لائیں۔ صبح کا وقت آٹھ بجے یا نو بجے بہتر ہوگا اگر یہ وقت آپ کے لیے موزوں نہ ہو تو شام چھ سات بجے۔

ضرب کلیم کی طباعت غالباً اس ماہ کے آخر تک ختم ہو جائے گی اور میرے افسوس اس پر غیر معمولی تصدیق ہوگئی اس میرے قصور نہیں پریس قصور ہے

محمد اقبال

24 جون 1936ء

لاہور۔ میو روڈ



پہلا باب

وطن، خاندان، ابتدائی زندگی

پنجاب سے شمال کی طرف کشمیر کا علاقہ ہے۔ جو اپنی شادابی اور سرسبزی کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کے قدم آئے کوئی نو سو سال ہو گئے ہیں۔ پہلے یہاں ہندوؤں کا راج تھا۔ پھر حکومت مسلمانوں کے قبضہ میں آئی اور ایران اور ترکستان کے کئی مسلمان خاندان یہاں آکر آباد ہو گئے۔ بہت سے ہندوؤں نے بھی اسلام قبول کر لیا اور آہستہ آہستہ یہ حال ہوا کہ مسلمان تعداد میں ہندوؤں سے بڑھ گئے۔

جب مغلوں نے پٹھانوں سے ہندوستان کی حکومت چھینی اور اکبر کی بادشاہی کا زمانہ آیا تو اس نے کشمیر کو بھی اپنے ملک میں ملا لیا۔ مدت تک یہ علاقہ مغل بادشاہوں کی سیرگاہ بنا رہا گرمی کے موسم میں وہ لاؤ لشکر سمیت یہاں اٹھ آتے۔ سیر اور شکار کا لطف اٹھاتے اور بہار کے مزے لوٹتے تھے۔

مغلوں کے بعد پٹھان کشمیر پر حاکم ہوئے۔ ان سے سکھوں نے حکومت چھینی۔ اور سکھوں سے ڈوگرہ راجپوتوں کو راج پاٹ ملا۔ آج یہ علاقہ ڈوگروں کے قبضہ میں ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ مغلوں کے بعد جو لوگ کشمیر کے حاکم ہوئے۔ ان کا زمانہ رعایا کے لیے اچھا نہیں تھا۔ لوگ حاکموں کے ظلم سے ایسے بے دل تھے کہ کسی کام میں ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ اس زمانے میں کئی دفعہ ایسا قحط پڑا کہ آدمی آدمی کو کھانے لگا۔ ہزاروں آدمی مر کھپ گئے۔ بہت سے خاندانوں نے تنگ آکر اپنے وطن کے خوبصورت سبزہ زاروں اور برفانی پہاڑوں کو چھوڑا اور پنجاب کے تپتے ہوئے میدانوں میں پھیل گئے۔ کچھ ہمت والے آگے بڑھے اور گنگا جمنا کے کنارے

پر ڈیرے ڈال لیے۔ پنجاب اور صوبہ جات متحدہ میں آج بھی بہت سے کشمیری خاندان آباد ہیں جو اپنی گوری چٹی رنگت اور ناک نقشے کی وجہ سے صاف پہچانے جا سکتے ہیں۔

ان لوگوں کی بولی الگ تھی اور وہ رسم و رواج میں بھی پنجاب کے میدانوں میں بسنے والوں سے نہیں ملتے تھے۔ جب کبھی وہ اردو یا پنجابی بولنے کی کوشش کرتے تھے۔ تو ان کے لہجہ سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ کشمیری ہیں۔ پھر بھی یہ پردیسی کچھ عرصہ کے بعد یہاں کے رہنے والوں میں گھل مل گئے۔ اور لہجہ اور لباس کا فرق بھی آہستہ آہستہ مٹ گیا۔ چونکہ یہ لوگ عقل و ذہانت کے پتلے تھے۔ اور ان کا ذہن آسانی سے ہر بات کی تہہ کو پہنچ جاتا تھا۔ اس لیے جس کام میں ہاتھ ڈالا کامیابی ہوئی۔ تجارت کی طرف جھکے تو سب سے آگے نظر آنے لگے۔ ملازمت کی جانب توجہ کی تو سرکار دربار میں انہی کا طوطی بولنے لگا۔

ان لوگوں میں جنہیں اپنے وطن میں چین نہ ملا تھا ایک شیخ خاندان بھی تھا جو کشمیر سے اٹھ کر سیالکوٹ میں آباد ہو گیا تھا۔ یہ لوگ اصل میں تو سپرو گوت کے برہمن تھے۔ لیکن ان کے بزرگ آج سے کوئی ڈھائی دو سو سال پہلے مسلمان ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اسی خاندان میں سے تھے۔

سیالکوٹ بہت پرانا شہر ہے اور پرانے زمانے کی اکثر کتابوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ یہ شہر ایسی جگہ آباد ہے۔ جہاں ریاست کشمیر کی سرحد انگریزی علاقہ سے ملتی ہے۔ اس لیے بہت سے کشمیری خاندان جن کے دلوں پر باپ دادا کے وطن کی محبت غالب تھی۔ یہیں بس گئے۔ اگرچہ پنجاب کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی اونچے نیچے مکان بے قاعدگی سے پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں ویسی ہی تنگ گلیاں ہیں ویسے ہی بازار لیکن شمال سے جو ہوا میں آتی ہیں وہ برفانی پہاڑوں سے گزرتی ہوئی کشمیر کی تھوڑی سی خنکی اپنے ساتھ لاتی ہیں۔

یہاں کے لوگ بہت جوشیلے مسلمان ہیں۔ 1857ء میں جب ہندوستان کے اکثر حصوں میں لوگ انگریزوں سے مقابلہ پر اٹھ کھڑے ہوئے تو صرف فیروزپور لدھیانہ اور سیالکوٹ ایسے شہر تھے جنہوں نے اس شورش میں حصہ لیا۔ اور اگر انگریز افسر عقل مندی سے کام نہ لیتے تو کوئی عجب نہیں کہ یہاں جو آگ بھڑکی تھی اس کے شعلے پنجاب کے دوسرے حصوں میں بھی پھیل جاتے۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے والد شیخ نور محمد بڑے نیک اور اللہ والے بزرگ تھے۔ سیالکوٹ میں ان کا چھوٹا سا کاروبار تھا۔ وہ اگر چاہتے تو کاروبار کو بڑھا کر دولت کما سکتے تھے۔ مگر دنیا کے دھندوں میں ان کا جی نہیں لگتا تھا۔ اس لیے تھوڑی سی آمدنی میں بڑے صبر اور شکر سے زندگی گزار دی۔

شیخ نور محمد کو بزرگوں کے پاس بیٹھنے اور دین کی باتیں سننے کا بڑا شوق تھا۔ اور اپنی نیکی اور پرہیزگاری کی وجہ سے سارے شہر میں وہ بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اسلام کی محبت ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور دنیا کے کاموں سے انہیں فرصت کا جو وقت ملتا تھا وہ نیک لوگوں کے پاس بیٹھ کر گزار دیتے تھے۔ یا پرانے بزرگوں کی کتابوں سے دل کو نورانی کرتے تھے۔

ان کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام عطا محمد تھا۔ اور چھوٹے بیٹے کا نام محمد اقبال۔ یہی محمد اقبال ہیں جو آگے چل کر ہندوستان بلکہ یوں کہو کہ ایشیا کے سب سے بڑے شاعر بنے۔

اقبال 1873ء میں پیدا ہوئے اس وقت پنجاب میں انگریزوں کی حکومت نئی نئی تھی۔ انہیں اس صوبہ میں قدم جمائے کوئی بیس پچیس سال ہوئے تھے اور 1857ء کا ہنگامہ تو کل کی بات معلوم ہوتا تھا۔ ان دنوں ہندوؤں میں تو انگریزی تعلیم کا اچھا خاصا چرچا ہو چلا تھا۔ اور ہندو نوجوان سکولوں میں انگریزی پڑھ لکھ کر چھوٹے بڑے عہدوں پر قبضہ کرتے چلے جاتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو

انگریزی پڑھنے لکھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور جو کوئی انگریزی پڑھ لیتا تھا۔ اسے کرستان کہتے تھے۔ شیخ نور محمد اگرچہ پرانی طرز کے آدمی تھے۔ اور مذہب کا انہیں بڑا خیال تھا لیکن انہوں نے غور کیا تو اولاد کو انگریزی تعلیم دلانے میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔ ان کے بڑے بیٹے شیخ عطا محمد جو اپنے چھوٹے بھائی سے تیرہ چودہ سال بڑے تھے پڑھ لکھ کر انجینئر بنے اور اقبال مشن سکول میں تعلیم پا کر کالج میں داخل ہو گئے۔

شیخ نور محمد کے دوستوں میں سیالکوٹ کے مشہور عالم مولوی میر حسن بھی تھے۔ مولوی صاحب مشن سکول میں عربی پڑھاتے تھے۔ اور ان کے پڑھانے میں ایک خاص بات یہ تھی کہ جو کچھ بتا دیتے تھے دلوں پر نقش ہو جاتا تھا۔ شیخ صاحب بیٹے کو انہیں کے حوالے کر آئے تھے۔ مولوی صاحب بڑے عقلمند شخص تھے اور قابلیت کے جوہر کی جانچ اور پرکھ کا بڑا سلیقہ رکھتے تھے۔ انہوں نے شاگرد کے شوق اور ذہانت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ کہ یہ لڑکا آگے چل کر بڑا نام پیدا کرے گا۔ اور اسے بڑی محنت سے پڑھانے لگے۔

اقبال پر بزرگوں کے طور طریقوں کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ انہیں دوسرے لڑکوں کی طرح کھیلنے کودنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ یا کتابیں پڑھتے یا بیٹھے کچھ سوچتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی وہ کسی گہری سوچ میں اس طرح کھو جاتے تھے کہ انہیں کسی بات کا ہوش نہ رہتا تھا۔

وہ چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے کہ ایک دن ان کے والد صبح سویرے مولوی میر حسن کے ہاں پہنچے اور کہنے لگے کہ مولوی صاحب! میں سوچتا ہوں اقبال آخر انگریزی تعلیم پا کر کیا کرے گا؟ اسے مذہب کی تعلیم کیوں نہ دی جائے۔ جس سے اس کی عاقبت سدھرے۔ اور دل میں قوم کی خدمت کا خیال پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہی اچھا ہے کہ اقبال سکول جانے کی بجائے مسجد میں آپ سے دینیات پڑھ لیا کرے۔

مولوی صاحب چپکے بیٹھے سنتے رہے۔ پھر کہنے لگے کہ یہ بچہ مسجد میں پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ سکول میں پڑھنے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ شیخ صاحب دل سے مولوی میر حسن کی عزت کرتے تھے اور انہیں اپنا اور اپنے خاندان کا خیر خواہ مانتے تھے۔ اس لیے یہ جواب سن کر چپکے ہو رہے اور بیٹے کو مسجد میں پڑھانے کا خیال چھوڑ دیا۔

اقبال ابھی سکول میں پڑھتے تھے کہ ان کی طبیعت کے اصلی جوہر چمکنے لگے اور انہوں نے شاعری کی طرف توجہ کی۔ اصل میں جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا تھا ان کے کانوں میں شاعروں کا کلام پڑنے لگا تھا۔ مولوی رومی فارسی زبان کے ایک بہت بڑے شاعر گزرے ہیں۔ ان کی مثنوی کی ایک مشہور کتاب ہے۔ جس میں انہوں نے نیکی اور دینداری کی باتیں اس مزے سے بیان کی ہیں کہ جو پڑھتا ہے۔ سر دھننے لگتا ہے۔ اقبال کے والد مثنوی کے عاشق تھے۔ اور اس کے شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔ ایک تو اقبال کو گھر میں ہی شعر سننے کا موقع ملتا رہتا تھا اور اس طرح انہیں شاعری کا اچھا خاصہ شوق ہو چلا تھا۔ پھر جب وہ سکول میں مولوی صاحب سے پڑھنے لگے تو ان کے اثر سے یہ شوق چمک گیا۔

اقبال ابھی سکول میں ہی تھے کہ وہ شعر کہنے لگے۔ پہلے پہلے خود بھی شعر پڑھ کر مزے لیتے رہے۔ پھر اپنے ہمجولیوں کو سنانے لگے۔ مرزا داغ اس زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ وہ اصل میں تو دلی کے رہنے والے تھے لیکن جب دلی سے مسلمانوں کی بادشاہت اٹھ گئی۔ اور انگریزوں کا عمل ہوا۔ تو حیدر آباد (دکن) کے نواب نے انہیں اپنے ہاں بلوا لیا۔ مرزا داغ کے شاگرد سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے اور دور دور کے لوگ انہیں اپنے شعر درست کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔ اقبال نے بھی ان کے پاس اپنا کلام بھیجا۔ انہوں نے ڈاک کے ذریعہ کلام کو درست کر کے بھیج دیا۔ اور خط میں ایسے الفاظ لکھے جس سے کم عمر شاعر کی ہمت بڑھ گئی۔

مولوی میر حسن خود تو شعر نہیں کہتے تھے۔ لیکن اچھے شعر کی جیسی پرکھ انہیں تھی شاید

ہی کسی کو ہو گی۔ انہوں نے بھی اقبال کے شعر سنے۔ تو تعریف کر کے جی بہلایا اور کہا کہ مشق کرتے رہو۔ اب اقبال کا یہ حال ہو گیا کہ فرصت کا جو وقت ملتا تھا وہ شعر کہنے میں گزار دیتے تھے۔ اور جو کچھ کہتے تھے اسے مرزا داغ کے پاس بھیج دیتے تھے ان دنوں سیالکوٹ میں ایک چھوٹا سا مشاعرہ بھی ہوتا تھا۔ وہاں بھی اقبال شعر پڑھا کرتے تھے۔ ان کی اس زمانے کی شاعری میں اگرچہ نہ زبان کی خوبیاں ہیں اور نہ وہ اونچے خیالات۔ جن کی وجہ سے ان کا نام آج دنیا بھر میں مشہور ہے۔ پھر بھی انہوں نے لڑکپن میں جو غزلیں کہی تھیں ان سے ہونہاری ٹپکتی ہے۔ ان کے استاد مرزا داغ نے دو تین غزلیں ہی دیکھ کر کہہ دیا تھا کہ میاں صاحبزادے تمہارے شعروں میں صرف کہیں کہیں تھوڑا سا ادل بدل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

شاعری کے اس شوق کے ساتھ ساتھ اقبال پڑھنے لکھنے میں بھی اپنی جماعت کے دوسرے لڑکوں سے آگے رہتے تھے۔ پرائمری اور مڈل کے امتحانوں میں وظیفہ لے کر انٹرنس میں پہنچے۔ اور انٹرنس کے امتحان میں پھر وظیفہ پایا۔ انہیں دنوں ان کا سکول ترقی کر کے کالج بنا۔ اور مولوی میر حسن اس کالج میں عربی فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اب نوجوان شاعر نے فارسی عربی میں خاصی لیاقت پیدا کر لی تھی۔ اور وہ مولوی رومی کی مثنوی اور فارسی کے دوسرے کتابوں کا مطلب اس خوبی سے بیان کرتے تھے کہ جو سنتا تھا۔ حیران رہ جاتا تھا۔ شاگرد کا شوق اور سوجھ بوجھ دیکھ کر مولوی صاحب بھی بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی محنت اور توجہ سے پڑھاتے تھے۔ مولوی صاحب کے سینکڑوں شاگرد تھے۔ رات دن پڑھنے پڑھانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ کالج کے علاوہ گھر پر بھی شاگردوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کوئی عربی کی کتاب لیے بیٹھا ہے۔ کوئی فارسی شعروں کے معنی پوچھ رہا ہے انہیں قصوں میں کالج کا وقت ہو جاتا تھا۔ اور مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ بعض شاگرد اس حالت میں بھی کتاب کھولے ساتھ ہوتے تھے۔ اور راستہ ہی میں ان سے پوچھتے جاتے تھے۔ مگر وہ سب

سے زیادہ اقبال پر مہربان تھے۔ اور مہربان کیوں نہ ہوتے؟ ان کے شاگردوں میں کون ایسا تھا جو شوق اور ذہانت میں اقبال کا مقابلہ کر سکتا۔ ادھر مولوی صاحب کی زبان سے کوئی بات نکلتی تھی اور ادھر ان کا ذہن بجلی کی سی تیزی سے اس کی تہہ کو پہنچ جاتا تھا۔ دوسروں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا ہاں ہوں کرتے اور منہ تکتے رہ جاتے۔

سیالکوٹ کا مشن کالج ان دنوں ایف اے تک تھا اقبال نے ایف اے کا امتحان پاس کیا تو صلاح ٹھہری کہ انہیں بی اے کی تعلیم پانے کے لیے لاہور بھیج دیا جائے۔ جب وہ اپنے بزرگوں رشتہ داروں اور بچپن کے دوستوں سے رخصت ہو کر لاہور پہنچے تو دل میں کچھ غم کچھ خوشی غم داس بات کا کہ جن لوگوں کے ساتھ اتنی عمر گزری آج ان کا ساتھ چھوٹتا ہے لاہور میں تعلیم کا بہت اچھا انتظام ہی۔ لیکن مولوی میر حسن سا مہربان استاد کہاں ملے گا اور خوشی اس بات کی تھی کہ لاہور میں آگے پڑھنے اور نام پیدا کرنے کے بہت سے موقعے ہیں۔ وہاں جی کے حوصلے خوب نکلیں گے۔ جن عالموں اور شاعروں کا نام مدت سے سن رہے ہیں ان سے ملاقاتیں ہوں گی۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی ہونہاری اور لیاقت کا سب کو یقین تھا اور انہیں خود بھی اپنی ذہانت اور شوق پر بڑا بھروسہ تھا۔ مگر کسی کو اس بات کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ سیالکوٹ کے ایک کشمیری خاندان کا یہ نوجوان شہرت کے آسمان پر سورج بن کر چمکے گا۔



دوسرا باب

اقبال لاہور میں

آج سے چالیس پچاس برس پہلے لاہور اور آج کے لاہور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان دنوں شہر کے باہر کا حصہ جو اب سول لائن کہلاتا ہے۔ بالکل ویران پڑا تھا اور جن گلی کوچوں کی رونق اور گہما گہمی کا یہ حال ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ کھوے سے کھوا چھلتا ہے۔ وہاں دن دیہاڑے انسان کا نام ونشان نہیں ملتا تھا۔ صرف انارکلی میں رونق تھی۔ پھر بھی لاہور صوبے کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے آبادی اور رونق میں پنجاب کے تمام شہروں سے بڑھا ہوا تھا۔ یہاں علم کا چرچا بھی بہت تھا کئی چھوٹے بڑے کالج تھے۔ جن میں بڑے بڑے عالم پڑھانے کے لیے مقرر رہتے تھے۔

اس زمانے میں مسلمانوں میں تعلیم کا شوق پیدا ہو چکا تھا۔ ادھر علی گڑھ میں سر سید احمد خاں نے جو مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ تھے۔ علی گڑھ کالج قائم کر رکھا تھا۔ ادھر لاہور میں انجمن حمایت اسلام قائم ہو چکی تھی اور اس کے جلسے قومی میلے سمجھے جاتے تھے۔

اقبال لاہور آ کر گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے۔ کیونکہ وہاں تعلیم کا بہت اچھا انتظام تھا اور کئی لائق پروفیسر مختلف مضمون پڑھانے پر مقرر تھے۔ ان میں آرنلڈ صاحب تھے جو بڑے قابل شخص تھے۔ وہ مدت تک علی گڑھ کالج میں رہ چکے تھے۔ اور علی گڑھ میں رہ کر انہوں نے کالج کے بہت سے استادوں اور طالب علموں کے دلوں میں علم کا سچا شوق پیدا کر دیا۔ آرنلڈ صاحب اقبال سے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اور انصاف کی بات یہ ہے کہ اقبال نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ اگرچہ کسی کے سکھانے اور پڑھانے سے کوئی شخص شاعر یا فلسفی نہیں بن سکتا۔ یہ تو اللہ

کی دین ہے جسے چاہے دے دے۔ البتہ قابل استاد مل جائے تو وہ راستے سے بھٹکنے نہیں دیتا۔ اسے اقبال کی خوش قسمتی سمجھنا چاہیے کہ پہلے انہیں مولوی میر حسن سا استاد ملا۔ جس نے ان کی ذہانت کے جوہر کو خوب چمکایا اور سیدھے راستہ پر ڈال دیا۔ اس کا ساتھ چھٹا تو آرنلڈ صاحب نے ہاتھ پکڑ لیا۔

لاہور میں ان دنوں مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ جن میں اقبال اس زمانے کے مشہور شاعر اپنا کلام سناتے تھے۔ اقبال بھی ان محفلوں میں جانے اور اپنا کلام سنانے لگے۔ آہستہ آہستہ سب کی نظریں ان پر پڑنے لگیں۔ ان کی عمر بیس بائیس سال کی تھی کہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں انہوں نے ایک غزل پڑھی اس مشاعرہ میں مرزا ارشد گورگانی بھی تھے جو ان دنوں چوٹی کے شاعروں میں سمجھے جاتے تھے۔ جب اقبال اس شعر پر پہنچے۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرق انفعال کے

تو مرزا ارشد تڑپ اٹھے اور کہنے لگے میاں صاحبزادے سبحان اللہ۔ اس عمر میں یہ شعر۔

اقبال بی۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوئے تو وظیفہ لیا۔ ساتھ ہی عربی اور انگریزی میں اول آنے پر انہیں سونے کے دو تمغے بھی ملے۔ بی۔ اے پاس کر کے ایم۔ اے میں داخل ہوئے اور اس امتحان میں پاس ہونے پر انہیں سونے کا ایک تمغہ ملا۔ اور اورنٹل کالج میں فلسفہ پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔

جن دنوں وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ ان کی شاعری کا اچھا خاصا چرچا ہو چلا تھا۔ لیکن اب تک وہ عام شاعروں کے انداز میں غزلیں کہتے رہے تھے۔ اب ان کی شاعری کا رنگ بدلا اور انہوں نے قومی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ 1899ء میں انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ تو انہوں نے اس موقع پر اپنی نظم نالہ یتیم پڑھ کر سنائی۔ اس

نظم میں شاعر نے یتیموں کی مصیبتوں کا نقشہ کچھ ایسے درد بھرے انداز میں کھینچا تھا کہ سننے والوں کے دل بے چین ہو گئے اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ جلسہ ختم ہوا تو لوگوں نے شاعر کو گھیر لیا۔ وہ اس سے ہاتھ ملانے کے لیے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ پنڈال سے باہر جگہ جگہ دس دس پندرہ پندرہ آدمیوں کی ٹولیاں کھڑی تھیں اور اسی نظم کا ذکر ہو رہا تھا۔ اسی زمانہ میں شاعر نے "ہمالیہ" اور "ہندوستان ہمارا" دو اور نظمیں کہیں جن کا لفظ لفظ وطن کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان نظموں نے اقبال کی شاعری کی دھاک ہر طرف بٹھا دی اور ان کا نام پنجاب بھر میں مشہور ہو گیا۔

یہاں اردو شاعری کی نسبت دو لفظ سن لیں۔ اردو شاعری نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی ہے۔ اس لیے اردو کے پرانے شاعروں نے جو کچھ کہا ہے وہ فارسی شاعری کی نقل معلوم ہوتی ہے اسی قسم کی غزلیں ہیں۔ جن میں عشق و محبت کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایسے ہی قصیدے جن میں بادشاہوں اور امیروں کی تعریف میں زمین کو آسمان سے جا ملایا ہے یا پھر فارسی شاعروں کی تعریف میں مثنویاں لکھی گئی ہیں جن میں قصے کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔

اردو کے پرانے شاعروں میں ولی سب سے پہلا شاعر ہے جس نے سارے ہندوستان میں شہرت پائی ہے۔ اس کے بعد بہت سے شاعر پیدا ہوئے مگر ان میں میر تقی میر اور سودا بہت مشہور ہیں۔ سودا قصیدہ کے بادشاہ ہیں۔ غزلیں بھی خوب لکھتے ہیں۔ میر تقی کی غزلیں بہت سیدھی سادی اور صاف ہیں اور ان میں عجیب مٹھاس ہے اور لوچ ہے۔ جس سے دل اور زبان دونوں مزے لیتے ہیں۔ خواجہ میر درد جو اللہ والے بزرگ تھے انہی دونوں کے ساتھ قدم مارتے نظر آتے ہیں۔ ان کے بعد جرات۔ انشا اور مصحفی ہیں۔ مگر وہ انہیں لوگوں کے خیالات کو تھوڑا سا الٹ پھیر کے بیان کرتے ہیں۔ مثنوی میں میر حسن سب سے آگے ہیں۔ انہوں نے بدر منیر بے نظیر کہانی لکھی ہے اور لفظوں کا ایسا جادو باندھا ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ ان

کے پوتے میر انیس ہوئے ہیں۔ جنہوں نے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے حالات کو نظم میں بیان کیا ہے اور اس میں بڑا کمال دکھایا ہے۔ انہیں کے زمانے میں ناسخ، آتش، ذوق، مومن اور غالب ہوئے۔ ناسخ کا کلام تو بہت پھیکا ہے۔ البتہ آتش کے کلام میں اچھے شعر بھی نکل آتے ہیں۔ ذوق محاورے خوب باندھتے ہیں۔ قصیدہ بھی اچھا لکھتے ہیں لیکن شاعری میں وہ مومن اور غالب کو نہیں پہنچتے۔ غالب بھی اگرچہ غزل ہی لکھتے ہیں۔ مگر ان کے خیالات ایسے اونچے ہیں کہ کہیں کہیں عام لوگ ان کی بات ہی نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے ساتھ ان کے شعروں میں فارسی کے الفاظ بہت زیادہ ہیں مومن ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں ان سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔

جب انگریزی زبان کا اثر اردو پر پڑنے لگا تو اردو شاعری کا زمانہ بھی بدلا۔ لاہور میں ایک ادبی مجلس قائم ہوئی۔ جس میں محمد حسین آزاد، ارشد گورگانی اور حالی شامل تھے۔ ان مجلسوں میں غزلیں نہیں پڑھی جاتی تھیں۔ بلکہ کوئی مضمون لے کر اس پر شعر کہے جاتے تھے۔ امید، برکھا رت وغیرہ۔ مضمونوں پر اس زمانے کے اکثر شاعروں نے نظمیں کہی ہیں۔ مگر ان میں حالی سب سے آگے بڑھ گئے۔ اور اپنے کلام سے مسلمانوں کے دلوں کو گرمانے لگے۔ اقبال کے استاد داغ بھی اسی زمانے کے شاعر تھے۔ مگر انہوں نے پرانے ڈھرے کو نہیں چھوڑا۔ اور غزلیں ہی کہتے رہے اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ جیسی زبان ان کی ہے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہوتی۔ مگر ان کے ہاں زبان ہی زبان ہے۔ اونچے خیالات سرے سے نہیں۔

اقبال اگرچہ داغ کے شاگرد تھے اور پہلے پہل وہ بھی غزلیں ہی کہتے رہے مگر ان پر غالب اور حالی کا زیادہ اثر پڑا ہے۔ ان کی زبان اور اونچے خیالات کو دیکھو۔ تو غالب کے کلام کو دھوکا ہوتا ہے اور ان کی قومی شاعری پر نظر ڈالو تو معلوم ہوتا ہے کہ جو درد حالی کے سینے میں چھپا ہوا ہے وہی ان کے دل میں بھی چٹکیاں لے رہا ہے۔

اقبال نے ان دنوں جو نظمیں لکھیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی حالت دیکھ کر ان کا جی بہت کڑھتا تھا۔ اور جب انہیں ہندو مسلمانوں کی پھوٹ اور نا اتفاقی کا خیال آتا تھا۔ تو بے چین ہو جاتے تھے۔ ''میرا وطن ہی ہے'' اور ''نیا شوالہ'' اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ ان دونوں نظموں کے چند شعر سنو۔ ''نیا شوالہ'' یوں شروع ہوتا ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن اگر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
واعظ کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے

اسی نظم میں آگے چل کر انہوں نے محبت و اتفاق کا گیت یوں الاپا ہے۔

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بسا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہوا اپنا تیرتھ
دامان آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

دوسری نظم میں ہندوستانی بچوں کا قومی گیت ہے اس کا پہلا بند یوں ہے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اسی زمانے میں انہوں نے اور بھی بہت سی نظمیں لکھیں۔ جن کی زبان میں عجب مٹھاس اور لذت ہے۔ ان میں سے کچھ نظمیں تو ایسی ہیں۔ جن میں صبح شام برسات' پہاڑ کے دامن' پہلی رات کے چاند اور اس قسم کے دوسرے نظاروں کے نقشے کھینچے گئے ہیں اور کچھ نظمیں بچوں کے ڈھب کی ہیں۔ مکڑا اور مکھی۔ پہاڑ اور گلہری۔ بچے کی دعا۔ ہمدردی۔ ماں کا خواب۔ پرندے کی فریاد۔ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ کچھ نظموں میں بہت اونچے خیالات ہیں مثلاً عشق اور موت۔ شمع اور پروانہ۔ سرگذشت آدم۔ دل۔ خیالات کے لحاظ سے بہت اونچے پایہ کی نظمیں ہیں۔

ان نظموں کو پڑھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں اقبال کے خیالات پر انگریزی شاعری کا بہت اثر تھا۔ اس زمانے میں اور بھی بہت سے شاعر تھے۔ جو انگریزی شاعری کے اثر سے اس قسم کی نظمیں کہہ رہے تھے۔ چنانچہ نادر کاکوروی۔ سرور جہاں آبادی۔ خوشی محمد ناظر۔ اور میر نیرنگ اس زمانہ کے مشہور شاعر تھے۔ جن کے کلام میں اقبال سے ملتے جلتے خیالات کی جھلک نظر آجاتی ہے لیکن وہ ابھی انہیں نظموں میں جن میں اقبال نے کسی نظارے کی تصویر کھینچی ہے۔ ورنہ جہاں کہیں انہوں نے اس انداز سے ہٹ کر کوئی نظم لکھی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خیال ایک ہی اڑان میں آسمان کو توڑ کر گزر جانا چاہتا ہے۔

اقبال پہلے کچھ دن اورینٹل کالج میں پروفیسر رہے۔ پھر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے وقت کا زیادہ حصہ لکھنے پڑھنے میں گزر جاتا ہے۔ جس کمرہ میں وہ سوتے تھے۔ اس میں ایک بڑی میز پر کتابیں پڑی رہتی تھیں۔ کتابوں کے پاس ہی کاپی اور پنسل۔ جب طبیعت چاہتی تھی شعر کہنا شروع کر دیتے تھے۔ ان دنوں ان کی طبیعت میں بلا کی روانی تھی جب شعر کہنے لگتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا امڈا ہوا ہے۔ کبھی خود لکھتے تھے کبھی کوئی ملنے والا آجاتا تھا تو اسے لکھوا دیتے تھے شیخ عبدالقادر جو بعد میں سر ہوئے اور بڑے عہدوں پر پہنچے۔ ان دنوں ایک

رسالہ نکالتے تھے۔ جس کا نام مخزن تھا۔ پنجاب کے بڑے بڑے شاعروں کی نظمیں اسی رسالہ میں چھپتی تھیں۔ پنجاب کے علاوہ دوسرے صوبوں کے شاعر بھی اس رسالہ میں نظمیں چھپواتے تھے۔ اقبال سے شیخ عبدالقادر کا بڑا میل جول تھا۔ اس لیے اس زمانہ میں انہوں نے جو نظمیں کہیں وہ پہلے مخزن میں ہی چھپیں اور پھر سارے ملک میں مشہور ہو گئیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ شیخ عبدالقادر ملنے آئے اور شاعر نے انہیں شعر لکھوانے شروع کر دیے اور وہ دیر تک بیٹھے شعر لکھتے رہے۔ ایک دفعہ اقبال نے شیخ صاحب کو شعر لکھوانے شروع کیے۔ نظم بہت لمبی تھی۔ اس لیے ساری رات شعر لکھواتے رہے اور صبح ہوتے ہوتے نظم ختم ہو گئی۔

ان کے پرانے خادم علی بخش [1] کا بیان ہے۔ کہ جب کانگڑہ کا زلزلہ آیا۔ میں شیخ صاحب (حضرت اقبال) کے پاس نوکر تھا زلزلہ کیا تھا۔ خدا کا قہر تھا۔ پہلے ایکا ایکی کواڑ کھڑکھڑانے لگے۔ پھر اس طرح زمین ڈولی جیسے دنیا بالکل تباہ ہونے کو ہے۔ میں گھبرایا گھبرایا پھرتا تھا۔ کبھی کوٹھے پر چڑھ جاتا کبھی نیچے آ جاتا۔ شہر میں بہت سے مکان گر پڑے تھے۔ ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا جب زلزلہ آیا۔ تو شیخ صاحب اپنے کمرے میں لیٹے چارپائی پر کتاب پڑھ رہے تھے مگر جس طرح لیٹے تھے لیٹے رہے۔ ذرا ہلے جلے تک نہیں۔ ہاں میری گھبراہٹ دیکھ کر ایک دفعہ پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا اور کہنے لگے علی بخش یوں بھاگے بھاگے نہ پھرو سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاؤ۔ یہ کہہ کر پھر اس طرح کتاب پڑھنے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

---

[1] ''شیرازہ'' میں یہ واقعہ علی بخش کی زبانی چھپ چکا ہے۔

ان دنوں ان کا طریقہ یہ تھا کہ صبح اٹھ کر نماز اور نماز کے بعد اونچی آواز میں قرآن پڑھتے تھے۔ پھر ڈنٹر پیلتے تھے۔ کبھی کبھی مگدر بھی ہلاتے تھے۔ اتنے میں کالج کا وقت ہو جاتا تھا۔ وہ کچھ کھائے پیے بغیر کالج چلے جاتے تھے۔ اور دوپہر کو آ کر کھانا کھاتے تھے۔ عام طور پر کھانا وہ صرف ایک وقت کا کھاتے تھے۔ صبح کو چائے بھی نہیں پیتے

تھے۔ہاں کبھی کبھی رات کو نمکین چائے پی لیا کرتے تھے۔ایک دفعہ پورے دو مہینے رات کو اٹھ کر تہجد کی نماز پڑھتے رہے۔ان دنوں کھانا پینا بھی چھوٹ گیا تھا صرف شام کو تھوڑا سا دودھ پی لیا کرتے تھے۔

اسی زمانہ میں آرنلڈ صاحب ملازمت کی مدت ختم کر کے ولایت چلے گئے۔ انہیں گئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ اقبال کو یورپ جانے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خیال آیا۔چنانچہ 1905ء میں وہ بھی یورپ روانہ ہو گئے۔





تیسرا باب

یورپ کا سفر

اقبال ولایت پہنچتے ہی کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہو گئے اور فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس زمانے میں انہیں انگلستان کے بعض بڑے بڑے عالموں سے ملنے اوران کے خیالات سننے کا موقع ملا۔ ان میں ایک پروفیسر میک ٹیگرٹ تھے جن کا شمار فلسفہ کے ایک بڑے عالموں میں ہوتا تھا۔ ان سے اقبال نے فلسفہ میں بہت کچھ سیکھا ۔یہیں پروفیسر براؤن سے بھی ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے ایران اورفارسی زبان کے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اقبال کو فارسی زبان کا شوق تو بچپن سے تھا۔ لیکن لاہور آنے کے بعد ان کی توجہ فارسی سے ہٹ گئی تھی۔ کیمبرج میں یہ کجلائی ہوئی چنگاری پھر چمک اٹھی۔

کیمبرج سے فلسفہ کا امتحان پاس کرنے کے بعد انہوں نے ایران کے فلسفہ کے متعلق ایک کتاب لکھ کر جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی جرمنی سے واپس آ کر لندن میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا آرنلڈ صاحب ان دنوں لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ وہ چھٹی پر گئے تو اقبال چھ مہینہ تک ان کی جگہ عربی پڑھاتے رہے۔

دراصل اس زمانے میں ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب تک انہوں نے جو نظمیں کہی تھیں ان کا انداز یورپ کے شاعروں سے بہت ملتا جلتا تھا۔ یا پھر کبھی کبھار وہ نئے انداز کی غزلیں کہہ لیا کرتے تھے۔ مگر اب اس قسم کی شاعری ان کی نظر سے بالکل گر گئی۔ چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے ارادہ کر لیا کہ اب شعر نہیں کہوں گا۔ ایک دن انہوں نے شیخ عبدالقادر سے جو اس زمانہ میں وہیں تھے اپنے اس ارادہ

کا ذکر کیا۔ شیخ صاحب نے کہا کہ آپ کی شاعری ملک وقوم کے لیے بہت مفید ہے اور اس لیے آپ شاعری ہرگز نہ چھوڑیے۔ آخر بڑی بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ آرنلڈ صاحب جو کچھ کہیں۔ وہی کیا جائے۔ انہوں نے بھی یہی کہا کہ آپ کو ضرور شعر کہتے رہنا چاہیے۔ اور اقبال کو ان کا فیصلہ ماننا پڑا۔

اگرچہ انہوں نے یورپ میں رہ کر بہت تھوڑی نظمیں کہی ہیں۔ لیکن ان نظموں کو یورپ جانے سے پہلے کی نظموں کے ساتھ رکھو تو دونوں میں بہت فرق نظر آتا ہے۔ خیالات کے لحاظ سے یہ نظمیں بہت اونچی ہیں۔ پھر یہ خیالات بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں ان نظموں میں حسن کا ذکر بار بار آیا ہے مگر ہر دفعہ نئے ڈھنگ سے۔ پھر وہ اس ذکر میں ہر بار کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ گئے ہیں۔

بعض نظموں کو پڑھنے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت میں کچھ بے کلی اور بے چینی سی ہے اسے کسی بات کی ٹوہ ہے۔ جسے وہ ابھی تک نہیں پا سکا۔ وہ کسی چیز کے کھوج میں ہے۔ جس کا کوئی اتا پتا نہیں ملتا۔ اس کے سامنے کچھ الجھنیں پڑی ہیں۔ جو کسی طرح سلجھائے نہیں سلجھتیں۔ اس کے دل میں بار بار کچھ سوال پیدا ہو رہے ہیں۔ جن کا جواب اسے نہیں سوجھتا۔

اصل میں اقبال نے یورپ پہنچ کر ایک ایسی دنیا دیکھی۔ جو اس کے لیے بالکل نئی تھی۔ یورپ والوں کی تہذیب میں اسے خوبیاں بھی نظر آئیں۔ اور برائیاں بھی۔ اس کی ظاہری بھڑک تو آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی تھی مگر جب شاعر نے اسے ٹٹولا تو اندر سے بالکل کھوکھلا پایا۔

اقبال کو اگرچہ اپنے وطن سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ یورپ جانے سے پہلے انہوں نے جو نظمیں کہی تھیں۔ ان میں یہ جذبہ جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ لیکن یورپ جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں وطن کی محبت نے لوگوں کی آنکھوں پر کچھ ایسی خود غرضی کی پٹی باندھ رکھی ہے کہ انہیں دوسری قوموں کے دکھ درد سے کوئی غرض نہیں۔ رات

دن اسی فکر میں ہیں کہ دنیا بھر کی دولت سمیٹ کر اپنا گھر بھر لیں۔ یورپ والوں کی اس آپا دھاپی سے ان کے دل پر بڑی چوٹ لگی۔ اور انہیں خیال آیا کہ اگر سب انسان ایک ہی کنبے کے لوگ ہیں تو پھر ان میں اتنا فرق کیوں ہے؟ یہ لوٹ کھسوٹ کب تک جاری رہے گی؟ کیا انسان کی زندگی کا مقصد یہی ہونا چاہیے جو یورپ کی قوموں کے سامنے ہے؟

ان کی طبیعت کی یہ بے چینی اور بے کلی اس زمانے کی کئی نظموں میں نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ ایک نظم میں کہتے ہیں:

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے
انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا

دوسری نظموں میں بھی جگہ جگہ اس طلب اور تلاش کا ذکر آیا ہے مثلاً

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا

آہستہ آہستہ یہ الجھنیں آپ ہی آپ دور ہوتی گئیں پردے سرکنے لگے بھید کھلتے گئے۔ دل میں جو سوال بار بار ہو رہے ہیں۔ ان کا جواب ملتا گیا اور شاعر کی بے چین روح کو تسکین سی ہونے لگی۔

اس زمانے کی آخری نظموں میں ان سوالوں کا پورا پورا جواب تو نہیں ملتا۔ لیکن کہیں کہیں ہلکے ہلکے اشارے ضرور ہیں سب سے بڑی بے کلی تو اس بات کی تھی کہ کیا یورپ والوں کی آپا دھاپی اور نفسی نفسی کا یہی حال رہے گا خدا کی زمین پر لوٹ کھسوٹ ہوتی رہے گی طاقتور اسی طرح کمزور پر ظلم کرتا رہے گا۔ کیا دنیا کو ان مصیبتوں سے

بچانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ مگر جب اسلام کی تعلیم پر غور کیا تو یہ بے کلی آپ ہی آپ دور ہو گئی جی نے کہا کہ یہ چیزیں چند دنوں کی مہمان ہیں زمانہ بدلے گا۔ تہذیب کا یہ ملمع جس پر انسان کی آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ آپ اتر جائے گا۔ اسلام کے اصول ملکوں ملکوں پھیلیں گے اور جو خیالات مدت سے سینوں میں دبے ہوئے ہیں ہر کوچہ اور بازار میں سنائی دیں گے۔ یہ خیالات انہوں نے اپنی ایک نظم میں بیان کیے ہیں جس میں بلا کا جوش اور روانی ہے۔ اس نظم میں وہ یورپ سے خطاب یوں کرتے ہیں:

دیار مغرب میں رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

معلوم ہوتا ہے اقبال نے اسی زمانے میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اب مسلمانوں کے جذبات کو ابھارنے اور اپنی گری ہوئی قوم کو اٹھانے پر اپنی شاعری کی ساری قوت خرچ کر دیں گے۔ چنانچہ اس نظم کے ایک شعر میں انہوں نے اپنے اس ارادہ کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔

میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری نفس میرا شعلہ بار ہو گا

یورپ میں رہ کر ان کے خیالات میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان میں یہ بات خاص طور پر ذکر کے قابل ہے۔ کہ اب وہ فارسی میں بھی شعر کہنے لگے۔ شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ ایک دعوت میں ان سے پوچھا کہ آپ فارسی میں بھی شعر کہتے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے فارسی میں ایک آدھ سے شعر سے زیادہ نہیں کہا۔ دعوت سے واپس آنے پر وہ بستر پر لیٹے لیٹے فارسی شعر کہتے رہے اور رات بھر میں دو غزلیں کہہ ڈالیں۔

ولایت سے واپس آکر اگرچہ انہوں نے اردو میں بھی بہت سی نظمیں لکھیں۔ لیکن اب فارسی کی طرف ان کی توجہ زیادہ ہوگئی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد تو انہوں نے اردو میں شعر کہنا ہی چھوڑ دیا۔ اور زندگی کے آخری سالوں میں پھر کہیں اردو کی طرف توجہ کی۔ اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو فارسی زبان شاعری کے لیے بہت موزون ہے۔ اور اس میں ہر قسم کے خیالات آسانی سے ادا کیے جا سکتے ہیں دوسرے اب اقبال کی شاعری کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ وہ جو کچھ کہتے تھے صرف ہندوستان کے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے کہتے تھے اور فارسی کے سوا کوئی زبان ایسی نہیں۔ جس کے ذریعے وہ اپنے خیالات دوسرے ملک کے مسلمانوں تک پہنچا سکتے۔

---

1. بانگ درا کا دیباچہ



چوتھا باب

ولایت سے آنے کے بعد

اقبال جنوری 1908ء میں ولایت سے آئے اور بمبئی' دہلی' انبالہ میں ٹھہرتے ہوئے لاہور پہنچے ان کے استقبال کے لیے اسٹیشن پر ان کے دوستوں اور شہر کے معزز لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ شام کو دوستوں کی طرف سے ایک پارٹی دی گئی۔ جس میں کئی شاعروں نے نظمیں پڑھیں۔ لاہور سے وہ سیالکوٹ گئے بزرگوں عزیزوں اور دوستوں سے ملے۔ اور کچھ دن وہاں رہنے کے بعد پھر لاہور آ گئے۔

ولایت جانے سے پہلے وہ گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اور کالج سے چھٹی لے کر گئے تھے۔ وہاں سے آنے پر وہ پھر گونمنٹ کالج میں پڑھانے لگے۔ لیکن اب انہیں پانچ سو روپے کی ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے ساتھ انہیں وکالت کرنے کی بھی اجازت تھی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ ولایت سے ہو آتے ہیں ان کے لباس وضع قطع اٹھنے بیٹھنے کے طریقوں اور خیالات میں بہت فرق آ جاتا ہے۔ اپنے ملک کی کوئی چیز انہیں پسند نہیں آتی۔ یہاں کے طور طریقوں رسموں ریتوں پر وہ ہنستے ہیں اور ولایت والوں کے خیالات کی پیروی کرنے پر فخر کرتے ہیں۔ مگر اقبال پر ولایت سے ہو آنے کا الٹا اثر ہوا ہے۔ اپنے ملک میں رہ کر یورپ والوں سے جن خیالات کا اثر ان پر اور ان کی شاعری پر پڑا تھا۔ ولایت جانے سے پہلے وہ بھی مٹ گیا اور وہ مذہب سے دور ہو جانے کے بجائے اس کی طرف زیادہ شدت سے جھک گئے۔ اب اسلام ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور ان کی محفل میں رات دن مذہب کے متعلق باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہاں اس کے علاوہ ولایت جانے سے ان میں کوئی فرق آیا تو وہ یہ تھا۔ کہ پہلے

وہ شیخ محمد اقبال تھے اب ڈاکٹر اقبال ہو گئے۔

ان دنوں ہندوستان میں جو لوگ اپنی قابلیت کی وجہ سے بہت نام آور تھے وہ سب اقبال کی لیاقت کا لوہا مانے ہوئے تھے۔ داغ اس زمانے کے مشہور شاعر اور اقبال کے استاد تھے۔ وہ اکثر ان کی تعریف کرتے رہتے تھے۔ حالی بھی اعلی درجہ کے شاعر تھے۔ اور اس لحاظ سے تو ہندوستان کے شاعروں میں ان کا پایہ بہت اونچا ہے۔ کہ انہوں نے سب سے پہلے قومی شاعری کی طرف توجہ کی اور مسلمانوں کو ان کی حالت پر غیرت دلائی۔ وہ ایک مرتبہ انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں آئے۔ اور اقبال نے ان کے سامنے جلسہ میں نظم پڑھ کر سنائی تو انہوں نے بہت تعریف کی۔ چونکہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے اور خود اپنا کلام پڑھ کر نہیں سنا سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اقبال سے ہی اپنا کلام پڑھوایا۔ اقبال نے حالی کے اشعار سنانے سے پہلے یہ رباعی پڑھ کر سنائی۔ جو اسی وقت کہی گئی تھی۔

مشہور زمانے میں ہے نام حالی

معمور مے حق سے ہے جام حالی

میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا

نازل ہے مرے لب پہ کلام حالی

چونکہ رباعی وقت اور موقعے کے لحاظ سے نہایت مناسب تھی۔ اس لیے بہت غل مچا۔ خود حالی نے بھی شاعر کو بہت داد دی۔

شبلی نعمانی ہندوستان کے بہت بڑے عالموں میں سے تھے۔ انہوں نے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جو اسلامی تاریخ کے متعلق ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ جیسی کتابیں وہ لکھ گئے ہیں ان کے بعد کسی کو لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی انہیں بھی اقبال کا کلام پسند تھا۔

اقبال کے کلام کے سب سے بڑے قدر دان حضرت اکبر الہ آبادی تھے اکبر خود

بہت اچھے شاعر اور مسلمانوں کے سچے ہمدرد تھے۔ انہوں نے شاعری کے پرانے انداز کو چھوڑ کر اپنے لیے بالکل نیا راستہ نکالا ہے۔ یعنی وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ نئی تہذیب پر چوٹیں کرتے اور جو لوگ ہر بات میں یورپ کی پیروی کو فخر کا باعث جانتے ہیں ان کا خوب خاکہ اڑاتے ہیں۔

اکبر نے اقبال کے نام جو خط لکھے ہیں ان کے لفظ لفظ سے دلی محبت ٹپکتی ہے۔ ان خطوں میں انہوں نے جگہ جگہ لاہور آکر اقبال سے ملنے کی خواہش کی ہے۔ مگر افسوس ان کی یہ آرزو پوری نہ ہونے پائی۔ اقبال بھی اکبر کا نام ہمیشہ عزت سے لیتے۔ اور ان کے خیالات کی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے خاص اکبر کے ڈھنگ میں کچھ شعر بھی کہے ہیں۔ جو ''اکبری اقبال'' کے نام سے مشہور ہیں۔

ان دونوں بڑے شاعروں کو ایک دوسرے سے جو اخلاص اور محبت تھی اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کے دل ایک ہی قسم کا درد تھا۔ اکبر نے تو زیادہ تر نئی روشنی کے نوجوانوں کے لباس اور ان کے انگریزی طور طریقوں اور عادتوں کا خاکہ اڑایا ہے۔ لیکن اقبال نے ان ظاہری چیزوں کی طرف توجہ دینے کے بجائے ان خالص انگریزی خیالات کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ جو ان کے دلوں میں جڑ پکڑ رہے ہیں اور شاعری کے پردے میں اسلام کی سچی تعلیم ان کے سامنے پیش کر دی ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ اس زمانے کے اکثر نامور ہندو بھی اقبال سے سچی محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ اور ان کی بعض نظمیں مثلاً ''نیا شوالہ'' اور ''ہندوستان ہمارا'' وغیرہ تو بچہ بچہ کی زبان پر چڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن ولایت سے آنے کے بعد ان کی شاعری کا رنگ ایسا بدلا کہ وہ صرف مسلمانوں کی پسند کی چیز بن کر رہ گئی۔ اس تبدیلی کی اصل وجہ تو ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقعہ پر طرابلس اور بلقان کی جنگوں کا بھی ذکر کیا جائے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک ان کی شاعری کا رخ بدلنے میں ان لڑائیوں کا بڑا حصہ ہے۔

اقبال نے جب شعر کہنا شروع کیا۔ اگر چہ اس وقت ہندوستان کو انگریزوں کے قبضہ میں آئے اچھا خاصا عرصہ ہو چکا تھا۔ اور اسلامی حکومت کی یاد ایک سہانا سپنا بن کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی مسلمانوں کو اس خیال سے بڑی تسکین تھی کہ اسلامی خلافت قائم ہے اور ترکی کا سلطان جو سارے مسلمانوں کا سردار ہے۔ ابھی تک تین براعظموں یعنی ایشیا یورپ اور افریقہ میں حکومت کر رہا ہے۔ اور اس زمانے میں تمام اسلامی ملکوں کے اندر یہ خیال بھی عام ہو رہا تھا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو آپس میں ایکا کر کے عیسائی سلطنتوں کے مقابلہ میں ترکی کی خلافت کا ساتھ دینا چاہیے۔

یہ خیال پھیلانے میں سید جمال الدین افغانی کا بڑا حصہ تھا۔ سید جمال الدین افغانی میں افغانستان کے رہنے والے تھے۔ لیکن بعض حالات ایسے پیش آئے کہ وہ گھر سے نکلنے پر مجبور ہو گئے۔ پہلے انہوں نے مصر اور ایران کی سیر کی پھر ترکی گئے۔ لیکن جہاں گئے۔ اپنی تقریروں سے ایک آگ سی لگا دی۔ اگر چہ انہیں اپنے مقصد میں پوری طرح کامیابی تو نہ ہوئی۔ پھر بھی ان کوششوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ مسلمانوں کے دلوں میں اتفاق اور اتحاد کے خیالات جوش مارنے لگے۔

ڈاکٹر اقبال کو یورپ سے آئے ہوئے دو ڈھائی سال ہوئے تھے۔ کہ اطالیہ نے ترکی سے طرابلس چھین لیا۔ ابھی یہ زخم تازہ تھا کہ بلقان کی عیسائی ریاستوں نے جو مدت سے ترکوں کے ماتحت تھیں بغاوت کر دی۔

اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو ایسا معلوم ہوا کہ انہیں ترکی خلافت کا جو تھوڑا سا سہارا تھا۔ وہ بھی مٹنے کو ہے۔ اگر چہ ترکوں نے اسلامی ملکوں کے معاملات کی طرف کبھی توجہ نہیں کی تھی تاہم ہندوستان کے مسلمانوں کو ان سے سچی محبت تھی۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ ترکوں کی حکومت کی تباہی صرف ایک اسلامی حکومت کی تباہی نہیں بلکہ اس طرح خلافت کا نام و نشان مٹ جائے گا اور ان کا کوئی مرکز نہیں رہے گا۔ چنانچہ جب انہیں معلوم ہوا کہ ترک دشمنوں میں گھر گئے ہیں تو ہندوستان میں ہر طرف کہرام

مچ گیا۔ اقبال کی طبیعت پر بھی ان واقعت کا بہت اثر ہوا اور چنانچہ انہوں نے اسی زمانہ میں شکوہ لکھا جو ان کی نظموں میں بہت مشہور ہے۔ اس نظم میں شاعر نے شکایت کے انداز میں خدا کے سامنے مسلمانوں کی بے کسی اور مظلومی کا حال بیان کر دیا ہے۔

اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں شکوہ پڑھ کر سنایا۔ ایک تو طرابلس میں اطالیہ کا حال سن سن کر مسلمانوں کے دل پہلے ہی دکھے ہوئے تھے اس نظم نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا اور ان کے جذبات بھڑک اٹھے۔

جو لوگ انجمن کے اس جلسہ میں شریک تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ جب اقبال نے نظم پڑھنی شروع کی تو کچھ دیر ہر طرف سناٹا چھایا رہا۔ لوگ اس طرح چپ چاپ نظم سن رہے تھے کہ جیسے کسی نے ان پر جادو کر رکھا ہو۔ وہ اکثر اپنی نظمیں لے سے پڑھتے تھے۔ ان کی آواز بھی بہت میٹھی تھی۔ جب وہ پڑھتے پڑھتے شکوہ کے آخری حصہ پر پہنچے تو ان کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اس طرح دلوں میں نشتر گھنگھولنے لگی۔ کہ آہوں اور سسکیوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

اقبال نے بہت سی اچھی اچھی نظمیں لکھی ہیں لیکن شکوہ سے زیادہ ان کی کوئی نظم مقبول نہیں ہوئی۔

یہ نظم لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر بک چکی ہے۔ اور آج گھر گھر اس کا چرچا ہے۔ بوڑھے بچے عورتیں مرد سب اسے پڑھتے سنتے اور اس کا لفظ لفظ پر سر دھنتے ہیں۔

اسی سال اکتوبر کے مہینے میں انہوں نے لاہور کی شاہی مسجد میں ایک چھوٹی سی نظم پڑھی نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامہ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا
فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضور آیہ رحمت میں لے گئے مجھ کو

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا

نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

شاعر نے عرض کیا:

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس نظم نے لوگوں پر شکوہ سے بھی زیادہ اثر کیا۔ شاہی مسجد میں اس وقت ہزاروں انسان موجود تھے۔ بہت سے لوگ آپس میں آس پاس دیہات سے چل کر آئے تھے لیکن اتنے لوگوں میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جس کی آنکھوں سے آنسو نہ بھر آئے ہوں۔ اس کے بعد اقبال نے طرابلس و بلقان کے متعلق کئی نظمیں لکھیں جو شاعر کے قلم سے نکلتے ہی بچے بچے کی زبان پر چڑھ گئیں۔ انہیں دنوں مسلمانوں کے اندر پہلی دفعہ بیداری کے آثار نظر آنے لگے۔ اس وقت تک وہ سرکار کے بڑے وفادار تھے مگر جب انہیں معلوم ہوا کہ یورپ کی تمام عیسائی سلطنتیں دل سے ترکوں کی دشمن ہیں اور ان ہیں مٹا دینا چاہتی ہیں۔ تو ان کے خیالات بدلنے لگے اس کے علاوہ ہندوستان میں بھی بعض ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے مسلمانوں کے دلوں کو سخت صدمہ پہنچایا۔ ان میں ایک تو کان پور کی مسجد کا واقعہ تھا۔ یہ واقعہ یوں ہوا کہ کانپور میں سرکار نے ایک

سڑک نکالی۔ اور مچھلی بازار کی مسجد کا ایک حصہ گرا دیا۔ مسلمانوں کو جب معلوم ہوا تو انہیں بہت غصہ آیا اور ہزاروں مسلمان جمع ہو کر مسجد کے ٹوٹے ہوئے حصہ کی اینٹیں چننے لگے۔ حکومت نے ان لوگوں پر گولی چلا دی اور بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔

دوسرا واقعہ احاطہ بنگال میں تقسیم کا تھا۔ 1908ء میں سرکار نے بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ چونکہ اس میں مسلمانوں کا فائدہ تھا اس لیے وہ بہت خوش ہوئے لیکن بنگال ہندوؤں نے اس پر ایسا شور مچایا۔ کہ 1911ء میں سرکار نے بنگال کی تقسیم کا حکم واپس لے لیا۔ اور اس کے دونوں حصوں کو ملا کر پھر ایک صوبہ بنا دیا۔

ان واقعات نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں یقین ہو گیا کہ جب تک ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہوتے۔ اس ملک میں عزت کی زندگی بسر کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ مسلمانوں میں ترقی کا جذبہ ابھارنے اور ان کے اندر قومی جوش پیدا کرنے میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا ابو الکلام آزاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے ان دنوں اخباروں میں جو مضمون لکھے انہوں نے مسلمانوں کو سیدھا راستہ دکھایا اقبال تو پہلے ہی یورپ کی قوموں سے مایوس تھے ان واقعات نے انہیں اور بدل کر دیا چنانچہ اس زمانے میں انہوں نے جو نظمیں لکھیں۔ ان میں جگہ جگہ واقعات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ ان نظموں نے مسلمانوں پر جادو کا اثر کیا۔ اور ان میں زندگی کی لہر پیدا ہو گئی۔

اکثر لوگوں کا اعتراض ہے کہ اقبال جو ایک زمانے میں سارے ہندوستان کے شاعر تھے وہ اب صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے شاعر بن کر رہ گئے ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اب اقبال کی شاعری کا دائرہ تنگ ہونے کے بجائے اتنا پھیل گیا کہ اس میں ساری دنیا آ گئی۔ وہ سارے انسانوں کو ایک ہی کنبہ کے لوگ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ انسانوں میں سے قوموں اور ملکوں کی تمیز مٹ جانی چاہیے۔ انہیں اپنے ملک کی دولت بڑھانے اور اپنی قوم کو فائدہ پہنچانے کی بجائے ساری دنیا کے فائدہ

اور آرام کا خیال رکھنا چاہیے۔ لیکن مسلمانوں کے سوا دنیا میں انہیں کوئی جماعت ایسی نظر نہیں آتی تھی جو رنگ قوم اور نسل اور ملک کی تمیز کو مٹا کر سارے انسانوں کو ایک کنبہ سمجھ لے۔ کیونکہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو وطن اور قوم کی تمیز کو نہیں مانتا اور ہر قسم کی اونچ نیچ مٹا کر سارے انسانوں کو ایک صف میں کھڑا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں کو ابھارنے میں اپنی ساری طاقت خرچ کر دی۔ انہیں یقین تھا کہ ایک دن مسلمان ساری دنیا پر چھا جائیں گے اور مختلف قوموں کو جو دراصل میں ایک ہی لڑی کے بکھرے ہوئے دانے ہیں پھر اکٹھا کر کے سارے انسانوں کو بھائی بھائی بنا دیں گے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال ولایت سے آنے کے بعد پھر گورنمنٹ کالج میں ملازم ہو گئے تھے۔ لیکن وہ ڈھائی سال کی ملازمت کے بعد انہوں نے استعفے دے دیا۔ کالج کے پرنسپل نے بہت کوشش کی کہ وہ استعفی واپس لے لیں مگر انہوں نے اس کی بت نہ مانی استعفے دے کر گھر آئے۔ تو دوستوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ملازمت کیوں چھوڑ دی انہوں نے جواب دیا کہ ملازم رہ کر میں آزادی سے اپنے خیالات ظاہر نہیں کر سکتا۔

انہیں ملازمت کے زمانے میں بھی وکالت کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن وہ کبھی کبھار ہی کوئی مقدمہ لے لیا کرتے تھے۔ اب انہوں نے بیرسٹری کی طرف زیادہ توجہ کی اور بہت سے لوگ ان کے پاس مقدمے لے کر آنے لگے۔ لیکن انہیں دولت کمانے کا شوق نہیں تھا۔ اس لیے صرف اتنے ہی مقدمے لیتے تھے جن کی آمدنی سے ان کا خرچ پورا ہو جاتا۔ وہ اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب بڑی باقاعدگی سے رکھتے تھے۔ چنانچہ اس قاعدہ میں انہوں نے مرتے دم تک فرق نہیں آنے دیا۔ ہر مہینے وہ اس بات کا اندازہ کر لیتے تھے کہ اب کے کتنے روپوں میں خرچ پورا ہو جائے گا۔ جب یہ خرچ پورا ہو جاتا تھا تو مقدمے لینا بند کر لیتے تھے۔

پانچواں باب

اقبال کی شاعری کا نیا دور

اقبال نے 1907ء میں یورپ کی قوموں کو مخاطب کر کے کہا تھا:

تمہاری تہذیب اپنے ہی خنجر سے خود کشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

یہ بات پوری ہو کر رہ۔ یعنی 1914ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی اور یورپ کی ساری قوموں کی قوت ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں صرف ہونے لگی۔

اقبال نے جنگ کی طرف توجہ نہیں کی۔ چنانچہ ان کی نظموں میں اس واقعہ کی طرف کہیں کہیں ہلکے ہلکے اشارے پائے جاتے ہیں۔ وہ ان دنوں چپ چاپ لاہور کے ایک گوشے میں بیٹھے فارسی کے شعر کہہ رہے تھے۔ یہ ان کی شاعری کا نیا دور تھا۔ صرف زبان کے اعتبار سے ہی نہیں۔ بلکہ خیالات کے لحاظ سے بھی ان کی اس زمانے کی شاعری بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔



شاعروں کی بڑی بڑی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ شاعر ہیں جو صرف خوب صورت الفاظ کو جوڑ کے دنیا کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ ان الفاظ میں کوئی نیا خیال ہے بھی یا نہیں۔ وہ تو صرف یہ دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں کہ انہوں نے الفاظ کے نگینے بڑی خوبی سے اپنی اپنی جگہ بٹھائے ہیں۔ انہیں ذرا آگے پیچھے کرو تو شعر کی خوبصورتی خاک میں مل جائے گی۔ اردو کے اکثر پرانے شاعروں کا یہی حال ہے۔ ان کے ہاں الفاظ تو بہت خوب صورت ہیں لیکن اور انہوں نے ان الفاظ کو جوڑا بھی خوب ہے۔ لیکن خیالات کو دیکھو تو ایک شاعر اور دوسرے شاعر میں

کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

دوسری قسم کے شاعر وہ ہیں جن کے دلوں میں نئے خیالات موج مارتے ہیں۔ وہ انہیں ظاہر کرنے کے لیے لفظ تلاش کرتے ہیں اور انہیں اس طرح جوڑتے ہیں کہ ان کے دلی خیالات جوں کے توں ادا ہو جائیں۔ اردو میں اس انداز کے شاعر یا تو میرزا غالب تھے یا حالی۔ یوں تو میرزا غالب بھی غزل ہی کہتے تھے اور ان پر پرانے خیالات کا بہت اثر ہے پھر بھی انہوں نے غزل کے تنگ دائرہ میں نئی نئی راہیں نکالیں۔ حالی نے قومی شاعری شروع کی جو اردو میں بالکل نئی چیز تھی۔ اور دکھ درد شعروں میں بیان کر دیا۔

اقبال کی شاعری پر غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح انسان پیدا ہوتا ہے۔ پھر بڑھتا اور بچپن اور جوانی کی منزلوں سے گزرتا ہے۔ اسی طرح اقبال کی شاعری بھی کئی منزلوں سے گزری ہے۔ ابتدائی زمانے کو جب وہ غزل کہتے تھے ان کی شاعری کا بچپن سمجھنا چاہیے وہ بھی دوسرے بڑے شاعروں کی طرح خوب صورت لفظوں کو جوڑتے اور انہیں دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ ان کی حالت اس بچے کی سی تھی جو سمندر کے کنارے سے گھونگھے اور سیپیاں اکٹھی کر رہا ہے اور انہیں ایک قطار میں رکھ کر خوشی سے پھولا نہ سمائے۔ پھر ان کی شاعری کے لڑکپن کا زمانہ بھی آیا۔ یعنی اس زمانہ میں جو خیالات یورپ سے ہندوستان میں آ رہے تھے۔ انہیں وہ اپنی زبان سے نئے ڈھنگ سے ادا کرنے لگے۔ لیکن ان کی شاعری کا لڑکپن بھی اس لحاظ سے بہت شاندار تھا کہ اس زمانے میں وہ جو کچھ کہہ گئے آج تک لوگوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا ہے۔

ان کی شاعری کی جوانی تو اسی زمانے سے شروع ہوتی ہے۔ جب وہ یورپ میں تعلیم پا رہے تھے۔ مگر جوں جوں دن گزرتے گئے۔ ان کے خیالات زیادہ پختہ ہوتے گئے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ لڑکپن اور نوجوانی میں انسان کے خیالات جلد جلد بدلتے

رہتے ہیں مگر جب عمر تیس سال کے اوپر ہو جاتی ہے تو انسان کسی چیز کے متعلق جو رائے قائم کر لیتا ہے۔ مرتے دم تک اس میں بہت تھوڑا فرق آتا ہے۔ یہی حال اقبال کی شاعری کا ہے۔

چونکہ ان دنوں ان کے دل میں ایسے ایسے خیالات موج مار رہے تھے جنہیں اردو میں پوری طرح ظاہر کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ اور فارسی زبان میں مشکل سے مشکل خیالات بڑی آسانی سے ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اور اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ فارسی زبان کے شاعر جو بات دو لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں اسے اردو میں بیان کرنا چاہو تو پورا جملہ کافی نہیں ہوتا۔ اس لیے اقبال بھی فارسی میں شعر کہنے لگے۔

فارسی میں انہوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ اس لحاظ سے بالکل نئی ہیں کہ یورپ یا ایشیا کے کسی شاعر نے انہیں چھوا تک نہیں۔ فارسی زبان میں مثنوی اسرار خودی ان کی پہلی تصنیف ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ انہوں نے 1914ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر پڑھ کر سنایا تھا۔ کوئی ڈیڑھ سال بعد یہ کتاب چھپ کر شائع ہو گئی اور اسے چھپے ہوئے دو سال ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنی دوسری مثنوی رموز بے خودی بھی شائع کر دی۔

ان دونوں کتابوں میں ڈاکٹر اقبال نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں انہوں نے لوگوں کو چونکا دیا۔ کیونکہ ان میں ایسی ایسی باتیں تھیں جو ان سے پہلے کسی شاعر نے نہیں کہی تھیں۔ اور تو اور ان کی صرف ایک نظم شمع و شاعر کے سوا ان کے اردو کلام میں بھی اس قسم کے خیالات کا کھوج نہیں ملتا۔

اسرار خودی میں اقبال نے خودی کو پہچاننے کی تلقین کی ہے۔ مگر اس نکتہ کو بہت تھوڑے لوگ سمجھے ہیں۔ زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی۔ جن کی سمجھ میں یہ تو نہیں آیا کہ شاعر کیا کہتا ہے۔ مگر خودی کا نام سن کر سب چونک پڑے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں اتنی گنجائش تو نہیں۔ کہ خودی پر بحث کی جائے۔ ہاں اس بحث کو سمیٹ کر دو لفظوں

میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ اپنے آپ کو جان لینا خودی کا پہچاننا ہے۔

آپ کہیں گے کہ ہر انسان اپنے آپ کو خدا جانتا ہے مگر اصل میں یہ جاننا جاننا نہیں۔ جاننا تو یہ ہے کہ انسان کو قدرت نے جو طاقتیں بخشی ہیں وہ ان سب سے اچھی طرح آگاہ ہو جائے۔ شیر جب تک شکار پر حملہ نہ کر دے۔ وہ نہیں جانتا کہ اس میں کتنی قوت ہے؟ یہی حال انسان کا ہے۔ جب تک وہ دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کی خودی دبی رہتی ہے۔ مگر جب کوئی سہارا نہیں رہتا۔ اور اسے اپنی قوت اور طاقت سے کام لینا پڑتا ہے۔ تو خودی ابھرتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ سمجھ لیتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب میرے ہی لیے ہے۔

کچھ لوگوں کو دھوکا ہوا ہے کہ خودی اور تکبر دونوں ایک چیز ہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ جو لوگ تکبر کرتے ہیں ان کی نظر اپنی طاقت اور قوت پر نہیں ہوتی۔ بلکہ انہیں اپنی کمزوریوں کا خیال رہتا ہے۔ اور ان کے جی میں یہ ڈر سا جاتا ہے کہ کہیں کوئی شخص ہماری کمزوریوں سے واقف نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ چلا چلا کر باتیں کرتے ہیں اور اپنی اور اپنے باپ دادا کی بڑائی کا ذکر کرتے نہیں تھکتے۔ اور اس طرح اپنے جی کے ڈر اور طبیعت کی بے چینی کو چھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

خودی کو تکبر سے کوئی تعلق نہیں۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے تو وہ بالکل نڈر اور بے باک ہو جاتا ہے۔ اس کی خودی خطروں میں زیادہ چمکتی ہے۔ اور جوں جوں مشکلات بڑھتی جاتی ہیں اس کی چھپی ہوئی قوتیں اور ابھرتی ہیں۔ وہ طاقتوروں کے مقابلہ میں اکڑ جاتا ہے۔ اور کمزور سامنے آئے تو اس سے بڑی شفقت اور محبت کا سلوک کرتا ہے۔

اگلے زمانے کے بہت سے شاعروں نے اس بات کو نہیں سمجھا۔ بلکہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے ہیں کہ انسان کو سب سے پہلے یونان کے ملک میں پیدا ہوئے اور جب

مسلمانوں نے یونان کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا تو بہت سے مسلمان شاعر یہ باتیں نئے نئے طریقوں سے بیان کرنے لگے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ انسان کو ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ اسے خدا پر بھروسہ کر کے ایک کونے میں بیٹھ جانا چاہیے۔ اگر کوئی شخص ہمیشہ کی زندگی پانا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے آپ کو مٹا ڈالے۔ اس قسم کے خیالات نے مسلمانوں کے بازوؤں کو سست اور تلواروں کو کند کر دیا ہے اور انہیں اپنے آپ پر بالکل بھروسہ نہ رہا۔ اقبال نے اسرار خودی میں ایسے شاعروں کی مخالفت کی ہے اور انہیں بھیڑیں کہا ہے ان کے خیالات نے قوم پر اثر ڈالا ہے اسے اچھی طرح مسلمانوں کے ذہن میں بٹھائے کے لیے اقبال نے ایک مزے کی کہانی بھی لکھی ہے

یہ کہانی یوں ہے کہ کہیں چراگاہ میں بہت سی بھیڑیں رہتی تھیں۔ چونکہ یہاں چارہ بہت تھا۔ اس لے ان بھیڑوں کی نسل خوب پھولی پھلی۔ اور ان کی تعداد برابر بڑھتی گئی۔ جب یونہی بہت مدت گزر گئی تو کرنا خدا کا کیا ہوا۔ کہ پاس کے جنگل میں کہیں سے کچھ شیر آ بسے انہیں جب بھوک لگتی تو بھیڑوں کے غلہ پر آ پڑتے۔ بھیڑوں نے اس بلا سے نجات پانے کے لیے بہت جتن کیے مگر کوئی تدبیر نہ چلی آخر ایک بوڑھی بھیڑ نے جو سب سے زیادہ عقل مند تھی سوچ سوچ کر اپنی قوم کو شیروں سے بچانے کا ایک طریقہ نکال ہی لیا۔

اس نے سوچا کہ بھیڑوں کو شیر بنانا تو کسی طرح ممکن نہیں۔ ہاں اگر شیر اپنی خوبو چھوڑ دیں تو ان میں اور بھیڑوں میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ چنانچہ اس نے شیروں کی کچھار میں جا کر یہ کہنا شروع کیا۔ کہ مجھے خدا نے تمہارے پاس پیغام دے کر بھیجا ہے اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو تم سب تباہ ہو جاؤ گے۔ جو لوگ طاقت ور ہیں اور بھیڑوں کو کھا کھا کے زندگی گزارتے ہیں ان کی موت قریب ہے۔ ہمیشہ کی زندگی حاصل کرنا چاہو تو ساگ پات پر گزارہ کرو اور اپنے آپ کو مٹا ڈالو کیونکہ جنت میں

صرف کمزوری جا سکتے ہیں۔

اس مکار بھیڑ کے وعظ کا یہ اثر ہوا کہ شیر گھاس کھا کر گزارہ کرنے اور جنت کے خواب دیکھنے لگے۔ آہستہ آہستہ ان کی ہمت بالکل جواب دے گئی۔ اور ان میں اور بھیڑوں[1] میں کوئی فرق نہ رہا۔ یہ شیر کون تھے؟ مسلمان۔ اور بھیڑیں۔ یونانی۔ جن کی کتابوں نے مسلمانوں کو کم ہمت بنا دیا۔ یہ شیر کون تھے؟ مسلمان۔ اور بھیڑیں۔ یونانی۔ جن کی کتابوں نے مسلمانوں کو کم ہمت بنا دیا۔

---

[1] مسلمان بادشاہوں میں عباسی خلیفہ بڑے رعب اور دبدبے والے حکمران تھے ان میں سے مامون الرشید بہت مشہور خلیفہ گزرا ہے۔ یونانی نسل کے عیسائی بادشاہوں کی سلطنت اس کی سرحد سے ملی ہوئی تھی۔ وہ اکثر ان کے ملک پر حملہ کرتا رہتا تھا۔ چونکہ مامون کو علم کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے ایک دفعہ اس نے عیسائی بادشاہ ہرقل کو لکھا کہ تمہارے پاس جو اگلے یونانی عالموں اور داناؤں کی کتابیں ہیں وہ ہر جگہ سے اکٹھی کر کے بھجوا دو۔ ہرقل نے اپنے درباریوں سے مشورہ کیا انہوں نے کہا اے بادشاہ بہتر یہی ہے کہ ان کتابوں کو عباسی خلیفہ کے پاس بھیج دیا جائے۔ کیونکہ ان میں ایسی باتیں لکھی ہیں جنہیں پڑھ کر مسلمانوں کے خیالات بدل جائیں گے ان میں لڑنے بھڑنے کی ہمت باقی نہیں رہے گی۔ ہمارے ملک کو آئے دن کے حملوں سے نجات مل جائے گی۔ یہ کہانی پڑھتے وقت ہمیں اس تاریخی واقعہ کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔

اقبال کے خیالات ان لوگوں سے مختلف ہیں۔ وہ قرآن کی سچی تعلیم سے ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہٹتے۔ اور کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو پہچانو۔ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے لیے ہے۔ ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھنا قوم کے لیے موت کا پیغام ہے۔ دل سے ڈر اور خوف بالکل نکال دو۔ دریاؤں میں کود پڑو۔ لہروں سے لڑو۔ چٹانوں سے ٹکرا جاؤ۔ کیونکہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں جنگ کا میدان ہے۔

☆☆☆

اسرار خودی لکھنے کے بعد اقبال کی توجہ اردو سے ہٹ گئی۔ اگرچہ اس زمانے میں ہندوستان سے فارسی کا رواج قریب قریب بالکل اٹھ چکا تھا۔ لیکن اقبال کی وجہ سے آہستہ آہستہ پھر لوگوں کی توجہ فارسی کی طرف ہونے لگی اور اکثر لوگوں نے تو صرف ان کا کلام پڑھنے کے لیے فارسی سیکھنی شروع کر دی۔

اقبال کا کلام پڑھو تو حیرت ہوتی ہے کہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک خیالات کس خوبی سے غیر زبان سے ادا کر دیتے ہیں۔ ان کے فارسی کلام کی ان خوبیوں نے مشہور شاعر گرامی کو ان کا گرویدہ بنا لیا تھا گرامی کو فارسی پر بڑا عبور تھا۔ اور اس زبان میں بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ اقبال کے وہ پرانے دوست تھے۔ اور کبھی کبھی اپنے وطن سے لاہور آتے تھے۔ انہوں نے اقبال کے نام جو خط لکھے ہیں انہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گرامی اگرچہ اقبال سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن انہیں اقبال سے اس قسم کی عقیدت تھی جو چھوٹوں کو بڑوں سے ہوتی ہے۔ اقبال بھی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اور جب کبھی لاہور آتے تھے تو ان کے آرام کا بڑا خایال رکھتے تھے۔ لیکن گرامی کی طبیعت کا عجب حال تھا۔ صبح ڈاکٹر اقبال کے خادم علی بخش نے آ کر پوچھا کہ مولانا آج کیا کھائیے گا۔ فرمایا اور جو چاہو پکا لو لیکن شلغم کا سالن ضرور ہو۔ جب دستر خوان بچھا اور شلغم نظر آئے تو بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ علی بخش کیا بازار میں صرف شلغم ہی رہ گئے ہیں صبح کو شلغم شام کو شلغم تم تو شلغم کھلا کھلا کر بیچارے بوڑھے گرامی کو مار ڈالو گے۔ اب یہ کون کہے کہ آپ نے خود ہی شلغم پکانے کو کہا تھا۔

گرامی مدت سے حیدر آباد کی سرکار میں نوکر تھے۔ کئی مرتبہ حیدر آباد گئے اور آئے۔ اکثر ایسا ہوا کہ حیدر آباد جانے کا ارادہ لے کر وہ ہوشیار پور جالندھر پہنچے۔ اور وہاں سے پھر ہوشیار پور چلے گئے۔ لاہور بھی مشکل ہی سے آتے تھے۔ لیکن جب آتے تھے

ڈاکٹر اقبال کے ہاں ٹھہرتے تھے۔ آپس کے اس میل جول نے ان دونوں شاعروں کے کلام پر کچھ نہ کچھ اثر بھی ڈالا۔ ڈاکٹر اقبال کے خیالات پر تو کیا اثر پڑتا؟ ہاں ان آپس کی ملاقاتوں میں اتنا ہوا کہ روز بروز بحثوں گفتگوؤں محاروں کی چھان بین سے ان کی زبان برابر منجھتی گئی اور گرامی کے آخری زمانے کی بعض غزلوں سے جو انہوں نے پرانے راستے سے ذرا ہٹ کر کہی ہیں صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ ان پر ڈاکٹر اقبال کے خیالات کا اثر پڑا ہے۔





چھٹا باب

خلافت اور کانگریس کی تحریکیں

1918 ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی ہندوستانیوں نے اس لڑائی میں انگریزوں کی بہت مدد کی تھی۔ اس لیے انہیں یقین تھا کہ جنگ ختم ہونے پر حکومت کی باگ ڈور ہمارے حوالے کردی جائے گی اور ان سے بہت سے وعدے بھی کررکھے تھے۔ لیکن جنگ ختم ہونے پر حکومت نے یہ وعدے پورے کرنے کی بجائے ایک سخت قانون جاری کردیا جس سے ہندوستانیوں کے دل ٹوٹ گئے۔

یہ قانون جس کا نام رولٹ ایکٹ تھا۔ کہ جو لوگ رعایا کو حکومت کے خلاف ابھارتے رہے ہیں انہیں سخت سزائیں دی جائیں۔ اس پر ہندوستانیوں میں بہت شور مچا امرتسر کے جلیانوالہ باغ میں لوگوں نے جلسہ کرکے اس قانون کے خلاف تقریریں کیں۔ جنرل ڈائر نے جو ایک اکھڑ فوجی افسر تھا۔ حکم دیا کہ جلسہ بند کردیا جائے۔ جب لوگوں نے پروا نہ کی تو اس نے گولی چلادی اور سینکڑوں آدمی مارے گئے۔ اس واقعہ نے لوگوں کے جذبات بہت بھڑکادیے۔ اور گھر گھر میں کہرام مچ گیا۔

اگرچہ ان واقعات سے ہندو اور مسلمان دونوں کے دل دکھے ہوئے تھے۔ مگر مسلمانوں کو انگریزی حکومت سے ایک اور بھی شکایت تھی۔ جنگ میں ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دے کر انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو ترکوں سے اکا قریب قریب سارا ملک چھین لیا گیا۔ چونکہ ترکی کے سلطان کو سارے مسلمان اپنا پیشوا ور خلیفہ سمجھتے تھے۔ اس لیے ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت صدمہ ہوا۔ جگہ جگہ خلافت کمیٹیاں بن گئیں اور حکومت پر زور دیا جانے لگا۔ کہ ترکی سے جو علاقہ چھینا گیا ہے اسے واپس دے دیا جائے۔

اس زمانے میں ہندوستان کے اندر بیداری کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ اور ہر طرف سے یہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں کہ ہندوستان میں ہندوستانیوں کی حکومت ہونی چاہیے۔ ان دنوں ملک کی مشہور سیاسی جماعت کانگریس نے لوگوں کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔ اور گاندھی جی ملک بھر کے لیڈر قرار پائے اب تک مسلمان کانگرس سے بالکل الگ رہے۔ مگر اب وہ اس مجلس میں شامل ہونے لگے ان دنوں بہت سے ہنگامے ہوئے پنجاب کے بڑے بڑے شہروں میں حکومت نے مارشل لاء جاری کر دیا۔ اور لوگوں پر بہت سختیاں کی گئیں۔ ادھر تو یہ رنگ اچھل رہا تھا۔ ادھر حکومت ملک کے انتظام میں بہت سی تبدیلیاں کر رہی تھی۔ اور نئے انداز کی کونسلیں بنائی جا رہی تھیں۔ یہ کونسلیں اگرچہ ہندوستانیوں کی امیدوں کے مطابق تو نہ تھیں۔ ہاں اب تک جس قسم کی کونسلیں بنائی گئی تھیں ان سے یہ بہت اچھی تھیں۔ بعض خاص خاص محکمے تو حکومت نے ایسے وزیروں کے حوالے کر دیے تھے جو عام لوگوں کے نمائندوں میں سے چنے جاتے تھے۔ لیکن کانگرس نے کونسلوں سے بائیکاٹ کی تجویز منظور کر لی۔ اور مسلمانوں کا ایک وفد خلافت کے متعلق بات چیت کرنے کے لیے ولایت گیا۔

اقبال کے دل پر بھی ان واقعات کا بہت اثر پڑا۔ اگرچہ انہوں نے عام جلسوں اور جلوسوں میں کوئی حصہ نہ لیا۔ مگر انہیں یہ دیکھ کر اتنی خوشی ضرور ہوتی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں آزادی کی امنگ پیدا ہو چلی ہے۔ البتہ انہیں یہ یقین نہیں آیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتفاق زیادہ دیر تک قائم رہ سکے گا۔ ان کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا۔ یعنی دو تین سال ہی گزرے تھے کہ ہندو اور مسلمانوں میں طرح طرح کے جھگڑے پیدا ہونے لگے۔

ترک ان دنوں میں کئی مصیبتوں میں گھرے ہوئے تھے ایک تو ان کا قریب قریب سارا ملک ان سے چھن چکا تھا جو باقی رہ گیا تھا اس پر یونان قبضہ کر لینا چاہتا تھا۔ آخر ایک ترک جرنیل مصطفےٰ کمال پاشا نے کچھ جاں نثاروں کو جمع کر کے یونان کو

کئی شکستیں دیں اور انگریزوں کو ترکی سے اپنی فوجیں ہٹانے پر مجبور کر دیا۔

اقبال ان دنوں پیامِ مشرق کے نام سے فارسی میں ایک نئی کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ اردو میں انہوں نے بہت تھوڑی نظمیں کہی ہیں۔ لیکن اپنی اردو نظموں میں انہوں نے جگہ جگہ اس زمانے میں واقعات کی طرف اشارے کیے ہیں مثلاً جب خلافت کے متعلق بات چیت کرنے کا مسلمانوں کا ایک وفد ولایت گیا تو انہوں نے کہا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

مسلمانوں کے مشہور لیڈر مولانا محمد علی کے قید ہونے پر بھی انہوں نے ایک نظم کہی ہے۔ ان کے علاوہ خضرِ راہ اور طلوعِ اسلام میں جو ان کی دو لمبی نظمیں ہیں اور انہیں دنوں کہی گئی تھیں انہوں نے اسلامی ملکوں کے اتحاد و اتفاق پر زور دیا ہے۔ اور مسلمانوں کو نسل اور وطن کی تمیز سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ اقبال وطن کے مخالف نہیں۔ انہوں نے اپنی اکثر نظموں میں ہندوستان کا ذکر بڑی محبت سے کیا ہے۔ البتہ وطن کی محبت کے متعلق یورپ والوں کے متعلق جو خیالات ہیں۔ انہیں وہ درست نہیں سمجھتے۔ اور انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعہ مسلمانوں کو انہیں خیالات سے بچانے کی کوشش کی ہے اس زمانے میں انہیں خاص طور پر ان باتوں کا ذکر کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہندوستان۔ ایران۔ مصر۔ ترکی میں وطن کی محبت کے خالص یورپی خیالات بہت رواج پا رہے تھے۔ اور اقبال کو اندیشہ ہو چلا تھا کہ مسلمان مٹی او

پتھروں کے اس ڈھیر کی خاطر جسے ملک اور وطن کہتے ہیں آپس میں لڑنا شروع نہ کر دیں۔

مصطفےٰ کمال پاشا اور اس کے ساتھیوں کی بہادری کے طفیل ترکی نے دوبارہ زندگی پائی تھی۔طلوع اسلام پڑھو تو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال کے دل پر اس واقعہ کا بڑا اثر تھا۔اور انہیں یہ امید ہو چلی تھی کہ یہ ترک بہادر ایشیا کی گری ہوئی قوموں خاص طور پر مسلمانوں میں زندگی کی لہر دوڑا دیں گے۔اور اسلامی ملکوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کا کام انہی کے ہاتھوں سے انجام پائے گا۔

مصطفےٰ کمال اور اس کے ساتھیوں کی بہادری کے متعلق انہوں نے جو اندازہ لگایا تھا وہ تو صحیح تھا لیکن انہوں نے اس سے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ کیونکہ کمال نے ترکی کی حکومت پر قبضہ کرتے ہی خلافت کو مٹا دیا۔اور ترکی میں جمہوری حکومت قائم کر کے وطن اور قوم کی محبت کے خیالات کو رواج دینا شروع کیا۔ ہاں اب چند سالوں سے ترکی کی توجہ پھر اسلامی ملکوں کی طرف ہو چلی ہے۔اور وہ ایشیائی قوموں کے معاملات میں دلچسپی لے رہا ہے۔کیا عجب ہے کہ اقبال نے ترکوں سے جو امیدیں باندھی تھیں وہ ایک دن پوری ہو کے رہیں۔

☆☆☆

جنگ کو ختم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا۔کہ کیمبرج یونیورسٹی کے یاک پروفیسر ڈاکٹر نکلسن نے اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔اس طرح انگریزوں کو پہلی دفعہ اقبال کے کلام ہونے کا موقع ملا۔پروفیسر براؤن نے لندن کے ایک رسالہ میں اس ترجمہ کے متعلق ایک مضمون لکھا اربھی کئی عالموں نے اس ترجمہ کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کیے۔اگرچہ ڈاکٹر اقبال کے خیالات یورپ والوں کے ڈھب کے نہیں تھے۔کیونکہ ان کی شاعری شہنائی کی میٹھی آواز نہیں بلکہ تلوار کی جھنکار ہے اور یورپ کے لوگوں کو جن کی طبیعتیں لڑائی بھڑائی سے اکتائی ہوئی تھیں اس قسم کے خیالات میں

لطف نہیں آ سکتا۔ اس کے علاوہ اقبال کا کلام پڑھ کر انگلستان کے بعض مصنفوں کے دل میں یہ اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اس قسم کے خیالات مسلمانوں کو ابھار کر ہمارے مقابلہ پر کھڑا نہ کریں پھر بھی اقبال کی شاعری میں جو خوبیاں ہیں وہ اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ اور اگرچہ اقبال نے خود کبھی کسی عہدہ یا خطاب کی خواہش نہ کی تھی۔ لیکن انہیں یورپ میں جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی طرف سے انہیں سر کا خطاب دیا گیا۔

انہیں دنوں ان کی دو کتابیں ''بانگ درا'' اور ''پیام مشرق'' شائع ہوئیں۔ بانگ درا میں ان کی اردو نظمیں ہیں جو اس سے پہلے مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکی تھیں۔ اس کتاب سے ان کے اصلی خیالات کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں اس زمانے کا کلام بھی شامل ہے جب ان کے خیالات پختہ نہیں ہوئے تھے۔ ہاں اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کے ساتھ ساتھ ان کے خیالات کس طرح ترقی کرتے گئے۔ کیونکہ اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ابتدا میں یورپ جانے سے پہلے کا کلام ہے پھر وہ نظمیں ہیں۔ جو انہوں نے یورپ میں لکھی تھیں۔ اور آخر میں وہ تمام اردو نظمیں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ جو انہوں نے یورپ سے آنے کے بعد مختلف موقعوں پر لکھیں۔ پیام مشرق ان کی فارسی نظموں کا مجموعہ ہے۔

حافظ ایران کا مشہور شاعر ہو گزرا ہے۔ اس کی غزلوں کے جواب میں جرمنی کے شاعر گوئٹے نے کچھ نظمیں دیوان مشرقی کے نام سے شائع کی تھیں ''پیام مشرق'' گوئٹے کے دیوان مشرقی کا جواب ہے۔ اس کتاب کی زبان بہت منجھی ہوئی ہے۔ خیالات کے لحاظ سے بھی یہ کتاب بہت اونچے پایہ کی ہے اور اس میں خودی کے فلسفہ کو نئے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

اسرار خودی کے بعد اقبال کی جتنی کتابیں لکھیں۔ انہیں پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ

ساری دنیا میں جہاں تہاں خودی ہی خودی چھائی ہوئی ہے۔ پہاڑ اپنی خودی میں مست سر اٹھائے کھڑے ہیں دریا خودی کی رو میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ بادل کا طنبور گڑگڑاتا ہے تو اس کی گرج سے خودی خودی کی آواز آتی ہے۔ بجلی کڑکتی ہے تو خودی کا راگ سنا جاتی ہے۔ فضا میں اڑنے والا عقاب جو سنگ خار کی چٹانوں میں اپنا آشیانہ بناتا ہے اور جنگل میں دہاڑنے والا شیر جو کھچار میں اپنا دربار لگاتا ہے۔ دونوں خودی میں مگن رہتے ہیں۔ تارے کہکشاں چاند۔ سورج۔ پیڑ پھول۔ ٹیلے۔ بیابان۔ غرض اس دنیا میں کون ہے؟ جسے خودی کی لگن نہیں۔ شاعر یہ سب کچھ دیکھتا سنتا پہاڑوں اور دریاؤں سے باتیں کرتا مسکراتا گنگناتا چال جا رہا ہے۔ کبھی لہروں اور چٹانوں کی گرم گرم اور مزیدار باتیں سننے کو تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتا ہے۔ کبھی کہکشاں اور تاروں کی گفتگو سے لطف اٹھاتا ہے۔ یہاں سے لوٹتا ہے تو شبنم کے ہونٹ ہلتے معلوم ہوتے ہیں۔ لوگ اس سے کہہ رہے ہیں کہ تو چاند کی دنیا میں اکیلی کیا کر رہی ہے؟ یہاں سے اتر دریا کی موجوں سے بغلگیر ہو۔ اور موتی بن کر چمک۔ وہ جواب دیتی ہے کہ میں دریا کی موجوں سے مل کر اپنے آپ کو کیوں مٹاؤں۔ میں تو کسی جنگل میں لالہ کی پنکھڑی پر جا گروں گی۔ جہاں میری ہستی قائم رہے گی۔

ترکی۔ مصر۔ انگلستان۔ جرمنی۔ روس وغیرہ ملکوں میں پیام مشرق کا بہت چرچا ہوا۔ چنانچہ ترکی کے ایک مشہور انشا پرداز حسین دانش نے جو اس سے پہلے اقبال کی بعض نظموں کا ترجمہ ترکی زبان میں کر چکا تھا پیام مشرق پر ایک مضمون لکھا۔ جو ترکی کے ایک مشہور رسالہ میں چھپا۔ ڈاکٹر فشر نے اپنا رسالہ اسلامیکا میں جو جرمنی کا مشہور رسالہ ہے۔ پیام مشرق کی بہت تعریف کی اور اقبال کا مقابلہ جرمن شاعر گوئٹے سے کیا۔ ڈاکٹر مانگلے نے جو جرمنی کے عالموں میں بہت اونچا درجہ رکھتا ہے پیام مشرق کے ایک حصہ کا ترجمان جرمنی زبان میں کر کے اسے اپنے ہاتھ سے کاغذ پر لکھا۔ اور

اس کے اردگرد بیل بوٹے بنا کر ڈاکٹر اقبال کے پاس تحفہ کے طور پر بھیجا۔ اسی طرح دوسرے ملکوں میں بھی اس کتاب کی بہت قدر کی گئی۔

اب تک اقبال کی نظمیں اکثر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہتی تھیں بلکہ بعض بعض کتاب فروشوں نے تو خاص خاص نظمیں کتاب کی صورت میں الگ بھی چھاپ دی تھیں۔ مگر اس زمانے سے اقبال نے اخباروں اور رسالوں میں نظمیں چھپوانا ترک کر دیا وہ جو کچھ لکھتے تھے ایک جگہ جمع کرتے جاتے تھے۔ اور جب کتاب پوری ہو جاتی تھی تو اسے چھپوا دیتے تھے۔ اس کے بعد شاید ہی دو تین موقعے ایسے آئے ہوں کہ انہوں نے اپنی کوئی نظم کسی اخبار یا رسالے میں چھپنے کے لیے دی ہو۔



ساتواں باب

اقبال سیاست کے میدان میں

اقبال نے اگرچہ اپنے کلام میں سیاست کے متعلق بڑے کام کی باتیں کہی ہیں اور ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ سیاست سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر ابھی تک انہوں نے سیاسی کاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ بلکہ چپ چاپ ایک گوشے میں بیٹھے تماشا دیکھتے اور حکومت کے ڈھنگ' سلطنت کے آئین اور ملکی معاملات کے متعلق شعر کے پردے میں اپنے خیالات ظاہر کر دیتے تھے۔ انہیں نہ لیڈر بننے اور لوگوں پر حکم چلانے کی خواہش تھی۔ نہ دولت سمیٹنے کی تمنا۔ کہنے کو وہ بڑے آدمی تھے مگر درویشوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے اور قناعت کا یہ حال تھا کہ وکالت میں بھی وہ صرف اتنے روپے کماتے تھے۔ جن سے گھر کا خرچ چل جاتا تھا۔

1926ء میں لوگوں نے ان سے کہنا شروع کیا کہ اگر آپ کونسل میں ممبر بن جائیں تو آپ کے ہاتھ سے مسلمانوں کے بہت سے کام نکلیں گے۔ اگرچہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان کے صوبوں میں جو کونسلیں بنی ہیں۔ ان کے اختیار بہت تھوڑے ہیں اور کوئی شخص ان کا ممبر بن کر قوم کی سچی خدمت نہیں کر سکتا۔ لیکن لوگوں نے کچھ اس طرح اصرار کیا کہ وہ مجبور ہو گئے۔

1926ء میں وہ لاہور کے حلقہ سے کونسل کی ممبری کے لیے کھڑے ہو کر کامیاب ہوئے اور پنجاب کے سیاسی معاملات میں جن سے وہ اب تک بالکل الگ تھلگ رہے تھے حصہ لینے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ لوگوں نے ان سے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ یعنی کونسل میں جا کر وہ کوئی زیادہ مفید کام نہ کر سکے۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ کیونکہ اول تو کونسل کے اختیارات کا دائرہ ہی اتنا تنگ

تھا کہ کوئی شخص اس کا ممبر بن کر کوئی فائدہ مند کام نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے سیاست میں وہی لوگ خوب چمکتے ہیں جو ہر طرح کے داؤں پیچ جوڑ توڑ سے واقف ہوں اور موقع پر انہیں برت بھی سکیں۔ اور ڈاکٹر اقبال بڑے سیدھے سادے اور نیک آدمی تھے۔ دنیا کے چھل فریب اور اونچ نیچ سے بالکل بے خبر ہاں جب کبھی تقریر کرنے کا موقع آیا ان کے دل میں جو کچھ تھا لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف کہہ دیا۔

اسی زمانہ میں ان کی ایک کتاب ''زبور عجم'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس میں بہت سی چھوٹی بڑی نظمیں ہیں۔ جن میں انہوں نے خودی کے فلسفے کو زیادہ کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اس کی زبان نہایت صاف اور ستھری ہے۔ اور خیالات بہت گہرے۔ بہت سے لوگ زبور عجم کو ڈاکٹر اقبال کی کتابوں میں سب سے اچھا سمجھتے ہیں۔ اور خود ڈاکٹر صاحب کو بھی زبور عجم اپنی ساری کتابوں سے زیادہ پسند تھی۔

1928ء میں مدراس سے انہیں لیکچر دینے کا بلاوا آیا۔ جاڑے کے دنوں میں وہ مدراس گئے۔ وہاں ان کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ مدراس سے وہ میسور اور میسور سے حیدر آباد تشریف لے گئے۔ لیکن جہاں گئے۔ لوگوں نے بڑی دھوم دھام سے ان کی پیشوائی کی۔ مدراس میں انہوں نے چھ انگریزی زبان میں لیکچر دیے۔ جو علیحدہ کتاب کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ ان لیکچروں میں انہوں نے اسلام کے متعلق بڑی نازک اور کام کی باتیں بیان کی ہیں۔

ان دنوں ہندوستان کے اندر بہت سے جھگڑے پیدا ہو رہے تھے۔ ان میں ایک بڑا جھگڑا یہ ہو رہا تھا کہ ہندوستان کی حکومت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھی حصہ ملنا چاہیے۔ اس بات کا فیصلہ ہونے میں کسی طرح نہیں آتا تھا۔ آخر انگلستان کی حکومت نے ہندوستان کے حالات کی جانچ پڑتال کے لیے ایک کمیشن بھیجا۔ چونکہ اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو نہیں لیا گیا تھا اس لیے بہت سے لوگ اس کمیشن کے بائیکاٹ کے حق میں تھے۔ کمیشن ہندوستان آیا۔ کچھ لوگوں نے اس کا بائیکاٹ کیا کچھ نے اس کی

حمایت کی۔ کمیشن واپس چلا گیا۔ تو ہندو مسلمانوں کے جھگڑوں کو مٹانے کے لیے پھر گفتگو شروع ہوئی۔ مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

1928ء میں مسلمانوں نے ایک نئی جماعت کی بنیاد ڈالی۔ جس میں مسلمانوں کی قریب قریب تمام انجمنوں کے لوگ شریک تھے۔ اس انجمن کا نام مسلم کانفرنس رکھا گیا۔ ڈاکٹر اقبال بھی اس انجمن میں شریک تھے۔

1930ء میں مسلمانوں کی پرانی انجمن مسلم لیگ نے الہ آباد میں اپنا سالانہ جلسہ کیا اور ڈاکٹر اقبال کو اس جلسہ کا صدر چنا گیا۔ انہوں نے اس موقع پر جو صدارتی تقریر کی اس میں بہت سی باتیں مفید تھیں۔ چنانچہ انہوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی فرمایا تھا کہ ار پنجاب سرحد بلوچستان اور سندھ کو ملا کر مسلمانوں کی ایک علیحدہ حکومت بنا دی جائے تو ہندو مسلمانوں کے جھگڑے خود بخود مٹ جائیں گے۔

ابھی ڈاکٹر اقبال کی اس تقریر کے الفاظ لوگوں کے کانوں میں گونج رہے تھے کہ ہندوستان کے طرز حکومت کا ڈھانچا تیار کرنے کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس کی گئی۔ اس کانفرنس میں انگلستان کی پارلیمنٹ کے ممبروں کے علاوہ ہندوستان کے نمائندے بھی شامل تھے ڈاکٹر اقبال بھی اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور واپسی پر ہسپانیہ اطالیہ اور مصر کی سیر بھی کی۔ ہسپانیہ میں پہنچ کر ان کی طبیعت پر بہت اثر ہوا۔ کیونکہ وہاں مسلمان آٹھ سو سال تک حکومت کرتے رہے ہیں اور اگرچہ اس ملک سے ان کی حکومت کو مٹے ہوئے پانچ سو سال ہو چکے ہیں اور عیسائیوں نے ان کی یادگاروں کو مٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ پھر بھی ہسپانیہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جگہ جگہ ان کی لٹی اور مٹی ہوئی نشانیاں باقی ہیں۔ ان میں ایک قرطبہ کی مسجد ہے جس کا جواب دنیا کے پردے پر نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ میں کئی اردو نظمیں لکھیں۔ جن میں ایک نظم تو انہوں نے مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔

کونسل کی ممبری کے زمانے میں ڈاکٹر صاحب کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ کونسلوں اور ان کی ممبریوں کے متعلق ان کا پہلا خیال درست تھا۔ ممبر بن کر انسان قوم کو کوئی خاص فائدہ تو نہیں پہنچا سکتا ہاں اگر سیاست کے جوڑ توڑ اچھی طرح جانتا ہو تو قوم میں نیک نامی اور شہرت ضرور حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے جب کونسل کی مدت ختم ہوئی اور ممبر دوسری دفعہ چنے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے انتخاب میں کوئی حصہ نہ لیا۔ پھر بھی اتنا ضرور تھا کہ وہ مسلمانوں کی قومی اور سیاسی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے رہتے تھے۔ لیکن ولایت سے آنے کے بعد ان کی طبیعت سیاست سے بالکل ہٹ گئی اور انہوں نے سیاسی مجلسوں میں بھی حصہ لینا چھوڑ دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انہیں سیاسی انجمنوں سے جو امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ دوسرے ان کی صحت پہلے کی سی نہ تھی۔ ہاں سیاست میں ان کی طبیعت کو جو لگاؤ تھا وہ کسی نہ کسی صورت میں برابر ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ ان کی محفل میں سیاست پر بحثیں بھی ہوتی تھیں۔ سیاسی کام کرنے والے لوگوں کو وہ مشورہ بھی دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے آخری سالوں میں جب مسلمانوں کے مشہور لیڈر مسٹر جناح لاہور آئے اور انہوں نے پنجاب میں مسلم لیگ کو مضبوط کرنا چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے بیماری کی حالت میں بھی ان کی بہت مدد کی۔



1932ء میں ڈاکٹر صاحب کی ایک اور کتاب شائع ہوئی۔ اس کتاب کا نام انہوں نے اپنے فرزند جاوید اقبال کے نام پر جاوید نامہ رکھا تھا۔ جاوید نامہ ایک لمبی فارسی نظم ہے۔ اس میں شاعر نے آسمان کی سیر کے حالات بیان کیے ہیں۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے کہ ایک شاعر پہاڑ کے پاس کھڑا مولوی رومی کی غزل گا رہا ہے اتنے میں مولوی رومی پہاڑ کے پیچھے سے نکل کر اقبال کے سامنے آجاتے ہیں اور انہیں اپنے ساتھ مختلف سیاروں کی سیر کراتے ہیں۔ ان سیاروں میں دنیا بھر کے مشہور لوگوں کی

روحوں سے ان کی ملاقات ہوتی ہے۔ جن میں اچھے برے ہر قسم کے لوگ ہیں۔ ان سے سوال وجواب ہوتے ہیں اور بڑے بڑے بھید کھلتے ہیں۔ سید جمال الدین افغانی دین اور وطن کا مطلب سمجھاتے ہیں مصر کے مشہور رہنما حلیم پاشا ترکوں کے نام پیغام دیتے ہیں اور انہیں قرآن پر چلنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ نادر شاہ ایرانی ایران کے حالات پوچھتا ہے۔ سلطان ٹیپو پوچھتا ہے کہ دکن کا کیا حال ہے؟ شاعر کو دکن کا سفر یاد آجاتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں دکن میں آنسوؤں کے بیج بو آیا ہوں۔ اس سے لالہ وچمن اگیں گے سلطان یہ سن کر کہتا ہے کہ دریائے کاویری کو جو میرے محل کے نیچے بہہ رہا ہے میرا پیغام دے دینا۔ پھر وہ زندگی اور موت کے متعلق ایسی باتیں کہتا ہے جنہیں پڑھ کر انسان کا خون جوش مارنے لگتا ہے۔

کشمیر کے مشہور شعر غنی اور میرزا غالب سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ اقبال غالب سے ایک شعر کے معنی پوچھتے ہیں غنی سے کشمیر کی نسبت بات چیت ہوتی ہے اور وہ اقبال سے کہتا ہے کہ ناامید نہ ہو۔ میری سوئی ہوئی قوم ضرور جاگے گی۔ جاوید نامہ کے اخیر میں شاعر نے نئی نسل کے نوجوانوں کو نصیحتیں کی ہیں اور ایسی ایسی کام کی باتیں بیان کی ہیں کہ جو ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

اٹلی کے مشہور شاعر دانتے نے آج سے کوئی چھ سو برس پہلے ایک کتاب لکھی تھی جس کا انداز جاوید نامہ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ اس نے بھی نظم میں آسمان کی سیر کا حال بیان کیا ہے اور جنت اور دوزخ کے نقشے کھینچے ہیں چنانچہ اس کتاب کی وجہ سے دانتے کا شمار دنیا کے بڑے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔

پہلے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ دانتے سے پہلے کسی کو یہ خیال نہیں سوجھا مگر اس زمانے کے عالموں نے بڑی چھان بین کے بعد یہ معلوم کیا کہ دانتے کو مسلمانوں کی کتابیں پڑھ کر اس انداز کی کتاب لکھنے کا خیال آیا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اور حدیثوں میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔

معراج تو خیر اور ہی چیز ہے۔ اور آنحضرت صلعم کے سوا کسی کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکا۔ لیکن بعض مسلمان صوفیوں اور شاعروں نے بھی اسی انداز میں اپنی اپنی سیر کا حال لکھا ہے اور اس انداز میں بہت سی باتوں کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کر دیے ہیں۔ دانتے نے یہ خیال نہیں کتابوں سے لیا ہے۔ اگر یورپ کا کوئی شاعر اس قسم کی کوئی کتاب لکھتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس نے دانتے کی پیروی کی ہے۔ لیکن ایک مسلمان شاعر اور خاص کر علامہ اقبال جیسے مسلمان شاعر کے لیے یہ انداز نیا نہیں۔





ساتواں باب

زندگی کے آخری چند سال

ڈاکٹر اقبال لاہور آئے۔تو کچھ دیر بھاٹی دروازہ میں رہے۔پھر وہاں سے انارکلی چلے گئے۔اور وہاں کوئی نو دس سال رہے۔انارکلی سے میکلوڈ روڈ پر بھی ایک کوٹھی میں اٹھ گئے اور چودھ پندرہ سال یہیں گزار دیے۔موت سے کوئی ڈھائی تین سال پہلے انہوں نے میو روڈ پر اپنی کوٹھی بنائی تھی اور اپنے فرزند کے نام پر اس کا نام جاوید منزل رکھا تھا۔

وہ لاہور آئے تھے تو صرف شیخ محمد اقبال تھے ولایت سے واپس لوٹے تو ڈاکٹر اقبال کہلانے لگے۔پھر گورنمنٹ نے انہیں سر کا خطاب دیا۔اور لوگ انہیں سر اقبال کہنے لگے۔لیکن انہیں سر اقبال کہنے والے تھوڑے تھے۔یہ سرکاری خطاب یا تو کتابوں رسالوں اور اخباروں میں کہیں کہیں لکھا جاتا تھا یا خطوں میں۔ورنہ عام طور پر لوگ انہیں علامہ اقبال کہتے تھے۔اور سچ تو یہ ہے کہ یہ لقب ان سے زیادہ کسی کو زیب نہیں دیتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی شاعری میں جو خوبیاں ہیں وہ ہندوستان کے اگلے پچھلے کسی شاعر میں نظر نہیں آتیں۔اور ان کا کلام انسان کے دل پر جادو کر سا اثر کرتا ہے۔لیکن جن لوگوں نے صرف ان کا کلام پڑھا ہے۔وہ ان کی خوبیوں کا کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ان کے علم اور قابلیت کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنہیں ان کے پاس بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا ہے۔آج ایسے سینکڑوں اور ہزاروں آدمی موجود ہیں۔جو فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم علامہ اقبال سے ملے تھے۔ان کی باتیں بھی سنی ہیں۔انہیں قرآن سن کر روتے دیکھا ہے۔خود انہیں کی زبان سے ان

کے شعروں کا مطلب بھی سمجھا ہے۔

علامہ اقبال بڑے آدمی تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں میں ایسا کوئی آدمی پیدا نہیں ہوا۔ جس نے اقبال سے زیادہ قوم پر اثر ڈالا ہو۔ یہ زمانہ اقبال کا زمانہ ہے۔ آج جو شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے اقبال کی زبان میں کہتا ہے۔ آج جو لیڈر قوم کو ترقی کی راہ دکھانا چاہتا ہے اسے اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں کہ اقبال ہی کے خیالات کو تھوڑے سے الٹ پھیر سے بیان کردے۔ اگر بڑائی اسی چیز کا نام ہے تو ان کے بڑے ہونے میں کوئی شک نہیں لیکن اگر تمہاری بولی میں بڑا آدمی اسے کہتے ہیں جس کے دروازے پر ہاتھی جھولتے ہوں تو گھر میں قالین بھی ہو۔ صوفے بھی ریشمی پردے بھی قیمتی گلدان بھی۔ سونے اور چاندی کے برتن بھی تو اقبال کو کسی طرح بڑا آدمی نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ایک سیدھے سادے درویش تھے۔ انہوں نے خود اکثر شعروں میں اپنے آپ کو فقیر اور درویش کہا ہے اور اس پر فخر کیا ہے۔

زندگی کے آخری سالوں میں ان کی شہرت کی یہ حالت تھی کہ ایک دنیا ان کے ہاں کھچی چلی آتی تھی۔ لوگ صرف انہیں دیکھنے کے لیے دور دور سے چل کر لاہور آتے۔ اور صرف ہندوستان کے لوگوں کا یہ حال نہیں تھا بلکہ دوسرے ملکوں کے لوگوں کو بھی ان سے ملنے کا ایسا ہی شوق تھا۔ لیکن وہ صرف اونچے درجے کے لوگوں ہی سے نہیں ملتے تھے بلکہ ان کے دروازے امیر غریب سب پر کھلے تھے اور وہ غریبوں سے بھی اسی طرح ملتے تھے۔ جس طرح امیروں سے کچھ لوگ صرف انہیں دیکھنے آتے تھے کچھ مشکل معاملات میں ان کا مشورہ لینے حاضر ہوتے تھے۔ کچھ اپنی حاجتیں لے کر۔ جو لوگ مشورہ لینے آتے تھے انہیں وہ صحیح مشورہ دیتے تھے۔ جنہیں کوئی حاجت کھینچ کر لاتی تھی ان کی مدد کرنے میں بھی بخل نہیں برتتے تھے۔ جو لوگ صرف ان سے ملنے آتے تھے۔ ان میں کچھ تو ایسے ہوتے تھے جو ان کا مرتبہ پہچانتے تھے۔ کچھ ایسے جو ان کا کلام سمجھتے تھے۔ اور ان کی طبیعت سے واقف تھے۔ وہ ان کی باتیں

بھی بڑے مزے سے سنتے تھے۔ اور ان کے سوالوں کا جواب دیتے تھے۔

ان کے علاوہ کچھ لوگ روز آنے والے تھے۔ کچھ دوسرے تیسرے روز آتے تھے۔ ان سب سے بھی ان کے برتاؤ کا یہ حال تھا کہ جس سے پہلے دن وہ جس طرح ملے تھے اسی طرح ہمیشہ ملتے رہے۔ کبھی اپنے طریقہ میں فرق نہ آنے دیا۔

آخری زمانے میں جب انہوں نے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ صبح سے شام تک لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ لیکن شام کو اچھی خاصی محفل گرم رہتی تھی۔

جاڑے کے موسم میں وہ اپنے کمرے میں ہی بیٹھتے تھے۔ لیکن گرمیوں میں مکان کے صحن میں یہ محفل لگتی تھی۔

آیئے آپ کو ان کی محفل کی ایک جھلک دکھلا دیں۔ مکان کے صحن میں چارپائی بچھی ہے۔ اس پر علامہ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ رنگت سرخ و سپید ہے۔ بھرا ہوا جسم۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ ناک نہ بہت چھوٹی نہ بہت بڑی۔ پیشانی فراخ۔ آنکھیں روشن۔ جو بہت سوچتے رہنے کی وجہ سے اندر دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ لباس صرف ایک سپید کرتہ اور تہ بند۔ سامنے حقہ پڑا ہے ارد گرد کرسیاں۔ لوگ آتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں ہر قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ سیاست شاعری فلسفہ۔ مذہب۔ مگر جس مضمون پر گفتگو چھڑ گئی ہے۔ اقبال گھنٹوں باتیں کیے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا ایک سیلاب ہے۔ کہ برابر امڈا آ رہا ہے۔ بیچ بیچ میں کوئی لطیفہ ایسا کہہ دیتے ہیں۔ کہ خشک سے خشک مضمون بھی دلچسپ بن جاتا ہے۔ انسان اس کی محفل میں کچھ دیر بیٹھ جاتا ہے اور جو جو باتیں سنی ہیں لوٹتے وقت راستہ میں ان پر غور کرتا جاتا ہے اور جی میں کہتا ہے کہ آج میں نے بہت سی نئی باتیں سیکھیں۔

اگرچہ ان کی باتیں بہت عجیب ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی یہ عادت نہیں تھی کہ جب کوئی نیا ملنے والا آئے تو اس سے کرید کرید کر حالات پوچھیں اور بات کرنے کا خواہ مخواہ کوئی موقع ڈھونڈیں۔ جب کوئی شخص بات کرتا تھا چپکے اس کی باتیں سنتے رہتے

تھے۔ اور جب بات کہہ چکتا تھا۔ جواب میں جو کچھ کہنا ہوتا تھا کہہ دیتے تھے۔ بات کرتے وقت لمبی تمہیدوں میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ اور اپنے خیالات مختصر الفاظ میں بیان کر دیتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی باتوں سے انسان کی طبیعت کبھی نہیں اکتاتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتے تھے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ خود ہی باتیں کیے جائیں اور کسی کو کچھ کہنے سننے کا موقع نہ دیں۔

عام طور پر وہ پنجابی میں باتیں کرتے تھے کبھی کبھی اردو بھی بولتے تھے۔ بیچ بیچ میں جب کوئی ایسا مشکل مضمون آ جاتا تھا جسے پنجابی میں ادا نہیں کیا جا سکتا تھا تو اسے انگریزی میں بھی ادا کر دیتے تھے۔

ان کی طبیعت میں خوش طبعی بہت تھی۔ باتیں کرتے کرتے کوئی لطیفہ سوجھ جاتا تھا۔ تو بڑی بے تکلفی سے بیان کر دیتے تھے۔ لیکن خدا نے ان کو ہر بات کے بیان کرنے کا ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کسی موقع پر بھی وہ تہذیب کے دائرہ سے نہیں نکلتے تھے۔

لوگ ان کی محفل میں بیٹھ کر ہر قسم کی باتیں کرتے تھے۔ مگر کسی بات پر انہیں اتنا افسوس نہیں ہوتا تھا جتنا مذہب سے مسلمانوں کی بے خبری پر۔ زندگی کے آخری دنوں میں کچھ لوگ ان سے ملنے گئے دیکھا کہ طبیعت بہت بے چین ہے آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہیں پوچھا خیر تو ہے؟ کہنے لگے آج ایک نوجوان مسلمان مجھ سے ملنے آیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار محمد صاحب کہتا تھا۔ مجھے سخت افسوس ہوا جس قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہے اس کا انجام کیا ہوگا؟ کئی دن تک اس واقعہ کا اثر ان کے دل پر رہا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انہیں سچا عشق تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ حال ہو گیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آتا تھا تو بے اختیار رو پڑتے تھے۔ کوئی حدیث بیان کرنے لگتے تھے۔ تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ قرآن سن کر ان کی عجب حالت ہوتی تھی۔ ایک دفعہ ایک عرب ملنے آ گیا۔ اس نے قرآن سنانا شروع

کیا تو ڈاکٹر صاحب بے قرار ہو گئے اور بے اختیار رونے لگے۔

ان کی باتوں میں عجیب اثر ہوتا تھا۔ ایک دفعہ پنجاب کے ایک مشہور پیر صاحب ان سے ملنے کے لیے آئے اور کہنے لگے۔ کہ ان دنوں سرکار کی طرف سے لوگوں کو زمین مل رہی ہے میں چاہتا ہوں کہ مجھے بھی تھوڑی سی زمین مل جائے۔ آپ مجھے درخواست لکھ دیجیے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا درخواست تو لکھے دیتا ہوں لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ درخواست کس کے سامنے پیش کرنی چاہیے؟ پیر صاحب اس سوال کا مطلب نہ سمجھ پاۓ اور ہوں ہاں کر کے رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا ایک مشہور کتاب ہے جس کا نام قرآن ہے۔ یہ کتاب خدا نے اپنے آخری نبی پر اتاری تھی جس کا نام محمد تھا۔ یہ نبی عرب کے رہنے والے تھے اور ان کی وفات کو تیرہ سو سال ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں لکھا ہے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اس لیے اگر آپ چاہیں تو میں خدا کے نام درخواست لکھ دوں۔

پیر صاحب پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا کہنے لگے کہ خدا مالک ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے تو کھانے کو بھی دے گا۔ لیکن میں مرتا مر جاؤں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا۔ کئی سال کے بعد وہی پیر صاحب علامہ اقبال سے ملنے آئے اور کہنے لگے کہ آپ نے مجھے غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچالیا اور اس کی نتیجہ یہ ہوا کہ خدا نے مجھے زمین بھی بخش دی۔

علامہ اقبال کے پوچھنے پر پیر صاحب نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ دلی گئے۔ وہاں فوج میں ان کے بہت سے مرید ہو گئے تھے۔ انہوں نے پیر صاحب کے آنے پر چائے کی ایک دعوت کا انتظام کیا۔ جس میں اپنے کمان افسر کو بھی بلایا۔ چائے پینے کے بعد انہوں نے کمان افسر سے کہا کہ صاحب بہادر ہمارے پیر صاحب کے لنگر کا خرچ بہت زیادہ ہے اس لیے سرکار سے انہیں کچھ زمین ملنی چاہیے۔ ان دنوں فوجی افسروں کی بہت چلتی تھی۔ کمان افسر نے کمانڈر انچیف کو لکھا۔ کمانڈر انچیف نے گورنر پنجاب سے

سفارش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیر صاحب کو زمین مل گئی۔

اکثر نوجوانوں کے دلوں میں مزہب کے متعلق کوئی شک پیدا ہو جاتا تھا ت ان کے پاس جا کر فوراً دور ہو جاتا تھا۔ بہتیری ایسی باتیں جن کا جواب عام مولوی نہیں دے سکتا لوگ ان سے جا کر پوچھتے تھے اور ایسا جواب ملتا تھا کہ پوری تسلی ہو جاتی تھی۔

علامہ اقبال کی جو عزت اور قدر ان کے زمانے کے بڑے بڑے لوگوں میں تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ترکی کے مشہور لیڈر غازی رؤف نے 1933ء میں ہندوستان آئے جامع ملیہ دہلی میں اقبال سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت جامعہ میں ایک جلسہ ہونے والا تھا۔ جس میں علامہ اقبال اور غازی رؤف بے دونوں کو تقریر کرنا تھی۔ جب جلسہ کا وقت ہو گیا اور یہ دونوں حال میں جانے لگے تو علامہ نے غازی رؤف کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان سے آگے چلنے کو کہا۔ مگر وہ پیچھے ہٹ گئے اور بڑے ادب سے کہنے لگے پہلے آپ چلیے۔ کیونکہ آپ ہمارے پیر ہیں اور ہم اپ کے مرید۔

لاہور سے تھوڑے فاصلہ پر شرق پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں ایک بزرگ میاں شیر محمد پیدا ہوئے جن کے انتقال کو صرف چند سال ہوئے ہیں میاں شیر محمد شریعت کے بڑے پابند تھے اور جو شخص ان کے پاس جاتا تھا۔ اسے ڈاڑھی رکھنے کی تاکید کیا کرتے تھے۔ علامہ اقبال نے ان کی نیکی اور پرہیز گاری کی شہرت سن کر ان سے ملنے کا ارادہ کیا۔ میاں شیر محمد مسجد میں بیٹھے تھے کہ یہ پہنچے۔ انہوں نے آنے کا سبب پوچھا۔ اقبال نے کہا کہ میرے لیے خدا سے دعا کیجیے۔ میاں شیر محمد بولے کہ تم ڈاڑھی منڈواتے ہو اس لیے میں تمہارے لیے دعا نہیں کرتا۔

علامہ یہ سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور مسجد سے باہر نکلے۔ چونکہ یہ تانگہ پر شرق پور گئے تھے اور تانگوں کا اڈہ مسجد سے اچھے خاصے فاصلہ پر تھا۔ اس لیے اڈہ تک پیدل چلنا

پڑا۔ ادھر کسی شخص نے جو اس وقت میاں شیر محمد کے پاس بیٹھا تھا ان سے کہا کہ پہچانا یہ شخص کون تھا؟ انہوں نے کہا نہیں ح۔ وہ کہنے لگا ڈاکٹر اقبال۔ یہ سن کر میاں شیر محمد کی عجیب حالت ہوئی۔ مسجد سے ننگے پاؤں اڈے کی طرف بھاگے علامہ اقبال تانگے پر سوار ہونے کو تھے کہ وہ آ پہنچے بہت عذر کیا کہ عام لوگوں کو داڑھی رکھنے کی تاکید کرتا ہوں آپ ایسے شخص پر جس نے قوم میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے ڈاڑھی کے معاملہ میں ایسی سختی کرنا میرے نزدیک درست نہیں۔

اقبال کی والدہ ان کی جوانی کے زمانہ ہی میں وفات پا گئی تھیں۔ البتہ ان کے والد نے اچھی خاصی عمر پائی اپنے فرزند کو اپنی آنکھوں سے شہرت اور عزت کے اس اونچے رتبہ پر پہنچے دیکھا۔ جہاں کسی کسی کو پہنچنے کا موقع ملتا ہے۔ اقبال ان کی بہت خدمت کرتے رہے اور ہمیشہ ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھا۔ اپنے بڑے بھائی سے بھی ان کا سلوک بہت اچھا تھا۔

وہ اپنے استاد مولوی میر حسن صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جب گورنمنٹ نے انہیں سر کا خطاب دینا چاہا۔ تو انہوں نے کہا کہ مجھے یہ خطاب اس شرط پر منظور ہے کہ میرے استاد کو شمس العلما بنا دیا جائے۔ مولوی صاحب کو بھی اقبال سے جس قدر محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ علامہ اقبال بیمار ہو کر علاج کے لیے دلی گئے۔ تو مولوی میر حسن صاحب جو اس زمانے میں آنکھیں کھو چکے تھے ایک آدمی کو روز سٹیشن پر اخبار انقلاب لینے بھیجتے رہے۔ اور علامہ اقبال کی بیماری اور علاج کا حال جو اس اخبار میں چھپتا تھا پڑھوا کر سنتے تھے۔

اقبال کو دنیا داری کے ڈھنگ نہیں آتے تھے۔ جو بات دل میں ہوتی تھی کسی جھجک کے بغیر صاف صاف کہہ دیتے تھے۔ اور بڑے بڑے آدمیوں کے سامنے بھی دل کی بات کہہ دینے سے نہیں رکتے تھے۔ ایک دفعہ دلی میں وائسرائے ہند سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وائسرائے نے ان سے کہا کہ آپ کل میرے ساتھ کھانا کھائیے۔ کوئی

دوسرا آدمی ہوتا تو اسے اپنے لیے بہت بڑی عزت سمجھتا۔ لیکن علامہ اقبال نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں کل دلی سے لاہور چلا جاؤں گا۔ اس لیے آپ کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ وائسرائے نے مجبور ہو کر اسی دن ان کی دعوت کا انتظام کرنا پڑا۔

وہ ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے تھے اسے آسانی سے نہیں بدلتے تھے۔ مگر جب انہیں معلوم ہو جاتا کہ ان کی رائے صحیح نہیں تھی تو اس پر اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں بحث کا انداز نہیں ہوتا تھا۔ کہ دوسرے کی نہ سنیں اور اپنی ہی کہے جائیں۔ جب کوئی شخص کوئی معقول بات کہتا تھا تو خواہ کیسا ادنیٰ درجے کا آدمی ہو۔ اسے مان لیتے تھے۔ ہاں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی ڈر یا لالچ سے اپنی رائے بدل دی ہو یا کسی بڑے آدمی کی ہاں میں ہاں ملائی ہو۔

وہ ہمیشہ سچ کہتے تھے۔ اس لیے کہ ایسے لوگوں کو جنہیں جھوٹی خوشامد سننے کی عادت پڑ گئی ہے ان کی باتیں بہت کڑوی معلوم ہوتی تھیں۔ اور اگرچہ وہ علامہ اقبال کے خلاف کھلم کھلا کوئی بات کہنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے تاہم وہ دل سے ان کے مخالف تھے۔ یہ حد کیے جاتے تھے کہ ہمارے پاس دولت بھی ہے اور حکومت بھی ہے لیکن لوگ ہماری پروا نہیں کرتے اور لاہور کے گوشے میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس کے پاس نہ دولت ہے نہ وہ کوئی اعلیٰ عہدے دار ہے۔ مگر صرف اپنی شاعری کی وجہ سے لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔

انہوں نے گھر کے سارے کام کاج نوکروں پر چھوڑ دیے تھے کسی کام میں خود دخل نہیں دیتے تھے۔ زندگی کے آخری زمانے میں ایک دفعہ بالیھڈ کے کچھ سوداگر ان کے پاس کچھ قالین لے کر آئے۔ اس وقت مولانا ظفر علی خان بھی وہیں بیٹھے تھے۔ علامہ نے کہا مولوی صاحب ذرا دیکھیے کہ یہ قالین کیسے ہیں۔ مولوی صاحب خود بھی ایسی باتوں میں کورے ہیں کہنے لگے کہ قالین تو اچھے معلوم ہوتے ہیں آپ خرید لیجیے۔ چنانچہ ہزار بارہ سو کے قالین خرید لیے گئے۔ اور سوداگر روپے لے کر چلتے

ہو گئے۔ کئی دنوں کے بعد آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ قالین بہت گھٹیا ہیں اور ان کی قیمت چار سو روپے سے زیادہ نہیں۔

ایسا اتفاق کبھی کبھی ہی ہوتا تھا کہ انہوں نے کوئی چیز خود خریدی ہو۔ ورنہ ان کے پہننے کے لکپڑے تک بھی دوسرے لوگ ہی پسند کرتے تھے۔ وہی خریدتے تھے اور سلواتے تھے۔ انہیں اس کا خیال نہیں تھا کہ کپڑا کیسا ہے اس کی قیمت کیا ہے۔ جیسا موٹا جھوٹا کسی نے لا کر دیا پہن لیا۔ ہاں کھانا وہ اچھا کھاتے تھے اور دستر خوان پر ہمیشہ دو تین سالن ضرور ہوتے تھے۔ شبدیگ پلاؤ اور تیخ کے کباب انہیں بے حد پسند تھے۔ لیکن کھانا صرف ایک وقت کھاتے تھے۔ نمکین چائے سے بھی بہت رغبت تھی۔ پھلوں میں انہیں آم بہت پسند تھے۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ قدرت نے میووں کو ترقی دے کر انگور بنائے اور انگور کو ترقی دے کر آم پیدا کیے لیکن آم بھی اکیلے نہیں کھاتے تھے۔ جب کبھی ان کے ہاں باہر سے آم آتے تھے۔ تو خاص خاص دوستوں کو بلا بھیجتے تھے۔

میاں نظام الدین لاہور کے ایک مشہور رئیس ہیں جن سے علامہ اقبال کے بڑے تعلقات تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لاہور بھر میں صرف میاں نظام الدین سے ان کے تعلقات تھے اور صرف انہیں کا گھر ایسا تھا جہاں وہ خود چل کر جاتے تھے میاں صاحب کے بہت سے باغ ہیں جن یں ہر قسم کے آم اکثر ہوتے ہیں۔ آموں کے موسم میں وہ اپنے کسی باغ میں علامہ اقبال اور ان کے خاص خاص دوستوں کو بلا بھیجتے تھے۔ آموں کی ان پارٹیوں میں شعر و شاعری کے چرچے بھی رہتے تھے۔ فلسفہ تاریخ سیاست کے متعلق بحثیں بھی ہوتی تھیں اور بڑا لطف رہتا۔

اب ذرا ان کے لباس کا حال بھی سن لو۔ ابتدا میں وہ شلوار اور کرتہ پہنتے تھے۔ سر پر سپید پگڑی ہوتی تھی یا لنگی ولایت جا کر انہیں انگریزی لباس بھی پہننا پڑا۔ لیکن ولایت سے آنے کے بعد وہ عام طور پر شلوار قمیض اور فراک کوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھی کوٹ پتلون پہن لیتے تھے۔ تو اس کے ساتھ بھی ہیٹ کی جگہ ترکی

ٹوپی ہوتی تھی۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں انگریزی لباس پسند نہیں
چنانچہ مرنے سے کچھ عرصہ پہلے اپنے صاحبزادے جاوید اقبال سے لباس کے متعلق
گفتگو کی اور فرمایا۔ مجھے شلوار پتلون زیادہ پسند ہے۔

خطوں کا جواب وہ بڑی باقاعدگی سے دیتے تھے۔ اور صرف دوستوں اور عزیزوں
کے ساتھ ہی ان کا یہ برتاؤ نہیں تھا۔ بلکہ جن لوگوں سے ان کی جان پہچان تک نہ تھی
ان کے خطوں کا جواب دینے میں بھی غفلت نہیں کرتے تھے۔ وہ جواب ہمیشہ خود لکھتے
تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب وہ لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے خط لکھوا دیا کرتے
تھے۔ وہ اکثر خط اردو میں لکھتے تھے۔

ان کا خط بہت خوب صورت اور پاکیزہ تھا۔ اور اس میں پرانے منشیوں کے خط کی
شان پائی جاتی تھی۔ آپ کے خط مختصر ہوتے تھے اور ان کی زبان نہایت صاف اور
شستہ۔ بعض خطوں میں انہوں نے بہت سے علمی ادبی اور سیاسی نکتے بیان کیے ہیں۔

علامہ اقبال بہت کم گھر سے باہر نکلتے تھے۔ جلسوں اور پارٹیوں میں بھی کبھی کبھی
ہی جاتے تھے۔ تھیٹر سینما کھیل تماشوں کا بھی انہیں شوق نہیں تھا۔ زندگی بھر میں شاید
انہوں نے صرف ایک دفعہ سینما دیکھا تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ اکثر مشاعروں میں
شریک ہوتے رہتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا۔
اور ان کی یہ رائے ہو گئی تھی کہ مشاعروں سے شاعری کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ بلکہ ان
سے بدمذاقی پھیلتی ہے۔ کیونکہ شعر تنہائی میں پڑھنے اور غور کرنے کی چیز ہے اور
مشاعروں میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شعر کے مطلب پر غور کرتے ہیں۔
شاعر کی زبان سے پورا مصرع بھی نہیں نکلنے پاتا کہ واہ سبحان اللہ کا شور مچ جاتا ہے۔

انہیں مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ فرصت کا جتنا وقت ملتا تھا۔ سب مطالعہ میں خرچ ہو
جاتا تھا۔ عام اخباروں اور رسالوں پر وہ ایک سرسری نظر ڈال لیتے تھے۔ اور کوئی کام کا
مضمون نظر آتا تھا تو اسے غور سے پڑھتے تھے۔ کتابوں میں بھی وہ کتابیں پڑھتے تھے

جوان کے ڈھب کی ہوتی تھیں۔

کبھی کبھی وہ مدت تک شعر نہیں کہتے تھے۔ لیکن جب شعر کہنے پر طبیعت آتی تھی تو بیٹھے بیٹھے بیسیوں شعر کہہ ڈالتے تھے۔ ان کے پلنگ کے پاس ایک تپائی پر کاپی اور پنسل پڑی رہتی تھی۔ جب جی چاہتا شعر کہنا شروع کر دیتے تھے۔ کبھی شعر کہہ لیتے تھے اور لکھتے نہیں تھے۔ مگر جب کوئی ملنے والا آتا تو اسے سارے شعر ایک ایک کر کے لکھوا دیتے۔ یہ طریقہ انہیں بہت ناپسند تھا کہ دو تین شاعر ایک جگہ مل بیٹھیں ایک دوسرے کو اپنے شعر سنائیں اور اپنی تعریف سن سن کر خوش ہوں۔ اس لیے جب کوئی شخص انہیں شعر پڑھنے کو کہتا تھا۔ تو انہیں بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ہاں جب ان کے جی میں آتا تھا شعر پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔ ان کے خاص خاص ملنے والوں نے ان کی اکثر نظمیں چھپنے سے بہت پہلے ان کی زبانی سنی تھیں۔ جب کبھی یو پی کا کوئی شاعر ان سے ملنے آتا تھا تو اسے توقع ہوتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب اس کا کلام سنیں گے۔ اپنے شعر سنائیں گے۔ مگر جب وہ ان کی طبیعت کا رخ اس طرف نہ پاتا تھا تو اسے بہت مایوسی ہوتی تھی اور جی ہی جی میں کہتا تھا کہ یہ کیسے شاعر ہیں۔

قومی جلسوں میں انہوں نے اکثر نظمیں پڑھی ہیں مثلاً جواب شکوہ جوان کی مشہور نظم ہے۔ انہوں نے موچی دروازہ کے باہر ایک عام جلسہ میں پڑھ کر سنائی تھی دربار رسالت شاہی مسجد میں پڑھی تھی ان کا قاعدہ تھا کہ ہر سال انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں ایک نظم پڑھ کر سناتے تھے لیکن آخری عمر میں یہ دستور ہی چھوٹ گیا تھا۔ آخری دفعہ انہوں نے 1931ء میں اپنی ایک اردو نظم جامعہ ملیہ دہلی کے ایک جلسہ میں پڑھ کر سنائی یہ نظم جوان کی اردو نظموں کی کتاب بال جبریل میں چھپ چکی ہے۔ قرطبہ کے متعلق تھی۔ جو مدت تک ہسپانیہ کی اسلامی حکومت کا پایہ تخت رہ چکا ہے۔ اس واقعہ سے کوئی تین سال کے بعد انجمن حمایت اسلام کے ممبروں نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے انجمن کے سالانہ جلسے میں نظم پڑھنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس زمانے میں

ان کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ خود نظم پڑھ نہیں سکتے تھے اس لیے ان کی جگہ ایک اور شخص نے نظم پڑھ کر سنائی یہ نظم ان کی ایک کتاب ضرب کلیم میں چھپ گئی ہے۔

علامہ نے مدت سے شعر کہنا چھوڑ رکھا تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں پھر انہوں نے اردو کی طرف توجہ کی اور اردو کی کچھ نظمیں تو انہوں نے گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں ولایت جانے سے پہلے لکھی تھیں۔ کچھ انگلستان ہسپانیہ اور فلسطین میں کہیں اور انہیں اکٹھا کر کے بال جبریل کے نام سے جنوری 1935ء میں شائع کر دیا بال جبریل سے کوئی ڈیڑھ سال کے بعد "ضرب کلیم" شائع ہوئی۔

بال جبریل علامہ اقبال کی کتابوں میں سب سے اونچا درجہ رکھتی ہے۔ جس شخص نے صرف بانگ درا پڑھی ہے جس میں زیادہ تر ان کے ابتدائی زمانہ کا کلام ہے وہ بال جبریل کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ کیونکہ علامہ اقبال کی شاعری کئی منزلیں طے کر کے اس اونچے مرتبہ تک پہنچی تھی۔ جہاں وہ بال جبریل میں نظر آتے ہیں۔ ان سب منزلوں سے واقف ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کا فارسی کلام بھی پڑھا جائے۔

اس کتاب کی جو نظمیں انہوں نے فلسطین اور ہسپانیہ میں لکھی ہیں وہ خاص طور پر بہت اچھی ہیں۔ یہاں ان کی نظموں کے ایک دو شعر نقل کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ پوری نظمیں پڑھنے سے ان کی خوبیوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

بانگ درا میں خودی کے فلسفہ کی جھلک کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے۔ بال جبریل میں خودی ہی خودی ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اقبال نے اپنی اکثر کتابوں میں صرف مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔ جاوید نامہ اور بال جبریل میں انہوں نے ساری دنیا کے غریبوں کو پیغام دیا ہے۔ مثلاً خدا کا پیغام فرشتوں کے نام بال جبریل کی ایک مشہور نظم ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

بال جبریل میں مزدور سرمایہ دار انسان کی ترقی اور ملک اور قوم کی آزادی کا ذکر نئے نئے طریقوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن علامہ اقبال کے نزدیک انسان کی ترقی آخری منزل وہ نہیں جہاں یورپ کے لوگ پہنچ چکے ہیں بلکہ ان کے خیال میں مسلمانوں کے لیے ترقی کی اور بھی بہت سی منزلیں ہیں۔ زندگی برابر بڑھتے چلے جانے کا نام ہے۔ اس راہ میں کوئی اکاؤ نہیں۔ بہت ہوا تو منزل پر پہنچ کر تھوڑی دیر کے لیے ستانے اور پھر چل کھڑے ہوئے۔ یہ بات بال جبریل میں انہوں نے کئی جگہ بیان کی ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی ہیں آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا

ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا

کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ان کا عرصہ سے خیال تھا کہ یورپ کے جو خیالات ہندوستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں میں پھیلے جاتے ہیں ان کا کھوکھلا پن ظاہر کیا جائے۔ یہ مقصد "ضرب کلیم" نے پورا کیا۔ اس کتاب میں نئے خیالات پر خوب خوب چوٹیں کی گئی ہیں۔ شاعر ملا۔ مصور کوئی بھی اس کے قلم سے نہیں بچا۔ لیکن ضرب کلیم میں سب سے زیادہ دلچسپ وہ اشعار ہیں جو انہوں نے محراب گل افغان کی زبانی کہلائے ہیں۔ پشتو کے مشہور گیت واقربان کی چھن میں ایک گیت بھی لکھا ہے اس کا ایک حصہ سنیئے:

رومی بدلے شامی بدلے بدلا ہندوستان

تو بھی اے فرزند کہستان اپنی خودی پہچان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

موسم اچھا پانی وافر مٹی بھی زرخیز

جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

اونچی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیسا دریا

جس کی ہوائیں تند نہیں وہ کیسا طوفان

اپنی خودی پہچان او غافل افغان

جو لوگ فارسی زبان نہیں جانتے۔ انہیں بال جبریل اور ضرب کلیم پڑھ کر اقبال کے خیالات کا اندازہ لگانا چاہیے۔ کیونکہ بانگ درا سے ان کے اصل خیالات کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں زیادہ تر ان کے ابتدائی زمانہ کا کلام ہے۔ اور اس زمانے میں ان کے خیالات ابھی پختہ نہیں ہوئے تھے۔

ان دونوں کتابوں کو غور سے پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمین کو خدا کی ملکیت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سارے انسان ایک کنبہ کے لوگوں کی طرح مل جل کر رہیں اور زمین کی خاطر ایک دوسرے سے نہ لڑیں جھگڑیں۔ چونکہ اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب نے ان باتوں کی تعلیم نہیں دی صرف یہی مذہب ایسا ہے جس نے وطن اور نسل کے جھگڑوں کو بالکل مٹا دیا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ان جھگڑوں سے نجات پانے کے لیے اسلام کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ قوموں کی آزادی کے پرزور حامی ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان کی خودی غلامی کی حالت میں مٹ جاتی ہے۔ آرام اور آسائش کی زندگی کو بھی وہ اچھا نہیں سمجھتے اور قوم کو تکلیفیں اور سختیاں جھیلنے کی عادت ڈالنا چاہتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ دین اور سیاست ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ مسلمانوں کے تمام سیاسی کام اسلام کے مطابق ہونے چاہئیں۔ اگرچہ وہ جگہ جگہ مسلمانوں کی حالت پر آنسو بہاتے ہیں۔ اور ان کے خیالات پر سخت نکتہ چینی بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ ان کی طرف سے ناامید بھی نہیں ان کا خیال ہے کہ ایشیائی قومیں جن کی حالت آج کل بہت خراب ہے۔ ایک نہ ایک دن پھر اٹھیں گی اور ان کو اٹھانے اور ابھارنے کا کام مسلمانوں کے ہاتھوں پورا ہوگا۔

علامہ اقبال کی زندگی کے آخری سالوں میں ایک دو واقعات ایسے ہوئے جن کا ذکر کر دینا ضروری ہے ان میں ایک اہم واقعہ افغانستان کا سفر ہے۔ کابل کی حکومت نے اپنے ملک کی تعلیمی حالت کو سنوارنے کے لیے ایک کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن میں علامہ اقبال سید سلیمان ندوی اور سر سید احمد خاں مرحوم کے پوتے سر راس مسعود شامل تھے۔ کابل میں ان کا بڑا شاندار استقبال ہوا اور وہاں کے مدرسوں کی حالت دیکھنے کے بعد افغانستان کے خاص خاص شہروں کی سیر کر کے واپس آ گئے۔ اس سفر میں وہ غزنی بھی گئے۔ اور وہاں مشہور صوفی شاعر حکیم سنائی کے مقبرہ کی زیارت کی۔ واپسی پر

انہوں نے ایک چھوٹی سی کتاب مسافر کے نام سے شائع کی اس میں جتنی نظمیں ہیں وہ سب اسی سفر کا نتیجہ ہیں۔

پھر جب اطالیہ نے حبشہ پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے ایک اور فارسی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' کے نام سے لکھی۔ اس مثنوی کے بعد ان کی کوئی اور کتاب ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوئی۔

1934ء میں وہ عید کی نماز پڑھ کر گھر آئے اور گرم دودھ ڈال کر سویاں کھا لیں۔ سویاں کھاتے ہی ان کی آواز بیٹھ گئی۔ بہتیرا علاج کروایا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جب گلے کی تکلیف بڑھ گئی تو انہوں نے ہائیکورٹ جانا بھی چھوڑ دیا۔ کچھ عرصے کے بعد نواب صاحب بھوپال نے پانچ سو روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ جو وفات تک انہیں برابر ملتا رہا۔

9 جنوری 1938ء کو یعنی ان کی وفات کے کوئی سوا چار مہینے پہلے مسلمان نوجوانوں کی ایک انجمن انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ نے یوم اقبال منانے کا انتظام کیا۔ ہندوستان میں جگہ جگہ یہ دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ بڑے بڑے عالموں نے ان کی شاعری کے متعلق تقریریں کیں۔ شاعروں نے نظمیں پڑھیں۔ اس موقعہ پر لوگوں نے علامہ اقبال سے جس قدر محبت اور عقیدت ظاہر کی۔ اسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ کسی شاعر کی زندگی میں اس کی ایسی قدر نہیں ہوئی ہوگی۔



آٹھواں باب

وفات

ڈاکٹر صاحب کو کچھ عرصہ سے درد گردہ کا مرض تھا۔ علاج سے یہ مرض کم تو ہو گیا۔ لیکن پوری طرح نہیں ہوا چوتھے پانچویں سال اس درد کے دورے پڑتے تھے۔ کبھی کبھی پاؤں کے انگوٹھے میں بھی درد ہو جاتا تھا۔ موت سے کوئی چار سال پہلے یکا یک ان کی آواز بیٹھ گئی۔ اس کے علاج کے لیے بھوپال گئے۔ کیونکہ وہاں بجلی کے علاج کا بہت اچھا انتظام تھا۔ اس علاج سے فائدہ تو ہوا لیکن بہت کم۔

1935ء میں ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا۔ اس واقعہ نے ان کے دل پر بہت اثر کیا۔ چنانچہ انہیں اس زمانے میں یقین سا ہو گیا کہ اب زندگی کے دن بہت تھوڑے باقی رہ گئے ہیں۔ ایک دن اکیلے بیٹھ کے وصیت لکھی۔ اور رجسٹرار کے پاس بھیج دی۔ اس وصیت میں انہوں نے چار آدمیوں کو اپنے بچوں کا گارڈین مقرر کیا تھا۔

وفات سے کوئی سال بھر پہلے ان کی آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ کچھ دنوں بعد سانس بھی پھولنے لگا۔ اٹھ کے غسل خانے تک نہیں جا سکتے تھے۔ دسمبر 1937ء میں طبیعت زیادہ بگڑنے لگی۔ قلب بہت کمزور ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی کندھے میں بھی درد ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں ڈاکٹروں کا علاج بھی ہوتا رہا۔ دلی کے مشہور طبیب حکیم نابینا صاحب نے حیدر آباد سے کچھ دوائیں بھیجیں وہ بھی کھاتے رہے۔ حکیم محمد حسن صاحب قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور بھی علاج کرتے رہے۔ ان دواؤں سے کبھی مرض کم ہو جاتا تھا کبھی تکلیف بڑھ جاتی تھی۔

اس حالت میں بھی وہ شعر کہتے تھے۔ جو لوگ ملنے آتے ان سے ہر قسم کی باتیں بھی کرتے تھے۔ پلنگ پر بیٹھے ہیں کہ باتیں کرتے کرتے سانس الٹ گیا دمے کے

دورے پڑنے لگے۔لیکن ذرا طبیعت سنبھلی تو پھر باتیں شروع کر دیں۔ان کے خاص خاص دوست جو روز ان کے پاس حاضر ہوتے تھے۔اس خیال سے چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے کہ باتیں کرنا ان کے لیے اچھا نہیں۔علامہ اقبال انہیں چپکا دیکھ کر کہتے تھے۔تم باتیں کیوں نہیں کرتے کچھ کہو۔جب تک میں باتیں کرتا رہتا ہوں طبیعت سنبھلی رہتی ہے۔

اس حالت میں بھی مسلمانوں کا خیال تھا ایک رات بہت دیر تک روتے رہے۔کسی نے پوچھا آخر آپ کیوں رو رہے ہیں فرمایا مسلمانوں کا خیال رہ رہ کر ستاتا ہے خدا جانے اس قوم کا کیا ہو گا؟ جب سے بیمار ہوئے تھے اونچی آواز سے قرآن نہیں پڑھ سکتے تھے۔پھر بھی لوگوں سے قرآن پڑھوا کر سنتے اور روتے تھے۔ایک دن اپنے خادم علی بخش سے کہا نماز پڑھنے کو جی چاہتا ہے اس نے لیٹے لیٹے ہی وضو کرا دیا۔اور چارپائی پر بیٹھ کر نماز پڑھی۔

ان کے دوستوں اور عزیزوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اب ان کی زندگی کے دن گنتی کے رہ گئے ہیں ایک دن ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد ان کی حالت دیکھ کر رو پڑے۔ان سے کہنے لگے۔آپ کیوں روتے ہیں کیا آپ کو یہ خیال ہے کہ اقبال مر جائے گا۔لیکن موت ایسی چیز تو نہیں کہ اس پر آنسو بہائے جائیں۔میں مسلمان ہوں اور مرنے سے نہیں ڈرتا۔

وفات سے تین چار روز پہلے بلغم سے خون آنے لگا۔ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ دل کی طرف جانے والی رگ کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہے۔20 اپریل کی شام کو ڈاکٹروں نے کہا کہ صرف چند گھنٹوں کی زندگی رہ گئی ہے۔اس رات کو تین بجے تک سوئے رہے۔پھر اٹھے تو طبیعت بے چین تھی۔صبح کے کوئی پانچ بجے پاؤں پھیلا دیے۔پھر آنکھیں اوپر کی طرف اٹھائیں اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے اللہ یہاں درد ہے۔ان کا پرانا خادم علی بخش اس وقت ان کے پاس تھا۔اس نے بایاں ہاتھ ان کے

دل پر رکھا اور داہنے ہاتھ سے سر کو تھام لیا۔ اتنے میں انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ منہ خود بخود قبلے کی طرف پھر گیا اور دنیا کو چھوڑ کر اپنے سچے مولا کے پاس جا پہنچے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علامہ نے 21 اپریل 1938ء کو انتقال کیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر 65 سال سے اوپر تھی۔

ان کی وفات کی خبر آناً فاناً لاہور میں پھیل گئی۔ بازار بند ہو گئے اور لوگ جاوید منزل کی طرف جانے لگے۔ شام کو جنازہ اٹھا اور شاہی مسجد کے میناروں کے سایے میں ان کی میت کو دفن کر دیا گیا۔ جنازہ کے ساتھ چالیس پچاس ہزار آدمی تھے۔

ا۔ تاریخیں نکالنا۔ اہم واقعات کی تاریخیں یاد رکھنے کا پرانا طریقہ ہے۔ یہ طریقہ جسے حساب جمل کہتے ہیں۔ اس طرح ہے کہ حرفوں کے خاص عدد مقرر کر دیے گئے ہیں۔ جب تاریخ نکالنی ہوتی ہے تو ایسے حرفوں کو کوئی جملہ یا مصرع بنا دیتے ہیں۔ جن کے عدد جمع کیے جائیں تو تاریخ نکل آئے مثلاً شمع خاموش میں ش کے 300 عدد ہیں م کے 40 ع کے 70 خ کے 600 و کا کے 6 پھر ش کے 300 انہیں جمع کرو تو 1357 ہوتے ہیں جو علامہ کے انتقال کی پوری تاریخ ہے۔

علامہ کی وفات پر ہندوستان بھر کے شہروں اور قصبوں میں جگہ جگہ ماتمی جلسے ہوئے اور ماتم پرسی کے تاروں اور خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ اخباروں میں ملک کے بڑے بڑے آدمیوں کے بیان چھپے۔ جن میں ان کی موت پر افسوس ظاہر کیا گیا تھا۔ بہت سے شاعروں نے اس موقع پر مرثیے لکھے۔ بہت سی تاریخیں اچھی کہی گئیں۔ بلکہ ہمارا تو خیال ہے کہ آج تک کسی شخص کی وفات پر اتنی تاریخیں نہیں کہی گئیں مثلاً جناب حفیظ ہوشیار پوری نے کئی تاریخیں نکالی ہیں۔ جن میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، بمرد اور آہ مفکر اعظم سے ان کی وفات ہجری تاریخ 1357ھ نکلتی ہے اور پیغمبر دین خودی کے عدد 1938 ہیں۔ حفیظ صاحب نے علامہ اقبال کے ایک مصرع

سے بھی ہجری تاریخ نکالی ہے۔ راحل ہوشیار پوری نے خضر راہ اسلام سے عیسوی تاریخ نکالی۔ خواجہ دل محمد صاحب نے بھی عیسوی اور ہجری تاریخیں بڑی خوبی سے نکالی ہیں اور انہیں یوں نظم کیا ہے:

شمع خاموش سال ہجری ہے

1357ھ

عیسوی شمع شاعری خاموش

1938ء

علامہ اقبال نے دو لڑکے اور ایک لڑکی اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ بڑے لڑکے سے وہ بیزار رہیں اس لے ان سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ چھوٹے لڑکے جاوید اقبال سے جن کی عمر چودہ سال کی ہے انہیں بہت محبت تھی۔ لڑکی کا نام منیرہ بانو ہے اور وہ ساتویں سال میں ہے۔

زندگی کے آخری دنوں میں انہوں نے اردو فارسی کی جو نظمیں لکھیں۔ وہ ان دنوں چھپ رہی ہیں۔ چونکہ انہیں حجاز جانے اور مدینہ شریف میں زندگی کے آخری دن گزارنے کی بہت تمنا تھی اس لیے انہوں نے اس کتاب کا نام ارمغان حجاز تجویز کیا۔

ارمغان حجاز میں کچھ فارسی نظمیں ہیں کچھ اردو۔ اور ان میں انہوں نے آزادی۔ وطن۔ قوم۔ دین۔ سیاست۔ پر اپنے خاص انداز میں بحث کی ہے۔ لیکن علامہ اقبال کو ان نظموں کو دوسری دفعہ دیکھنے اور ان میں کانٹ چھانٹ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے یہ نظمیں جس طرح لکھوائی تھیں اسی صورت میں شائع ہو رہی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اقبال امید کے گیتوں سے سوئے ہوئے دلوں کو جگانے والا مایوسیوں کی ہمت بڑھانے والا اقبال۔ اسلام کا سچا عاشق۔ ملت کا سوگوار اقبال ہم میں نہیں

رہا۔لیکن اس نے ہمارے دلوں کو یقین کے جس نور سے جگمگایا تھا اس کی روشنی شک
اور مایوسی کی تاریکی میں ہمیں ہمیشہ راستہ دکھاتی رہے گی۔ساز خاموش ہو گیا۔مگر فضا
اس کے نغموں سے قیامت تک گونجتی رہے گی۔

---

1 یہ سطریں لکھتے وقت ارمغان حجاز چھپ رہی ہے۔

☆☆☆

شیخ عنایت اللہ پبلشرز نے فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور 365 سرکلر روڈ لاہور میں
باہتمام عبدالحمید خاں پرنٹر کے چھپوا کر تاج کمپنی لمیٹڈ قرآن منزل ریلوے روڈ لاہور
سے شائع کیا۔

☆☆☆

مسلمان بچوں کے لیے

تاریخی کہانیوں کا سلسلہ

(مولفہ چراغ حسن حسرت)

بچوں کو تاریخ سکھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں تاریخ کے اہم واقعات کہانی کے پیرائے میں سنا دیے جائیں۔ حسرت صاحب نے یہ کہانیاں اسی لیے لکھی ہیں۔

جادو کا برج

مسلمانوں کے اندلس میں داخل ہونے کی داستان قیمت تین آنے

تدمیر کی سرزمین

تدمیر کی عیاری اور مسلمانوں کی فیاضی کی داستان قیمت تین آنے

شہزادہ عبدالرحمٰن

شہزادہ عبدالرحمٰن کا تخت پانا۔ قیمت تین آنے

شیخ ادریس

اندلس کے نامور فیاض عرب کی دلچسپ کہانی۔ قیمت تین آنے

خلیفہ عبدالرحمٰن

خلیفہ ناصر الدین اللہ کے حالات زندگی۔ قیمت تین آنے

وزیر منصور

وزیر ابی عامر منصور کا وزارت حاصل کرنا۔ قیمت تین آنے

ارطغرل

ایک مشہور ترک بہادر کی کہانی۔ قیمت تین آنے

طرابلس کی شہزادی

امیر المومنین حضرت عثمانؓ کے عہد کا مشہور واقعہ۔ قیمت تین آنے

قسطنطنیہ کی فتح

سلطان محمد فاتح کا قسطنطنیہ پر حملہ۔ قیمت تین آنے

عثمان کا خواب

ایک بہادر ترک سردار کا عجیب وغریب خواب۔ قیمت تین آنے

دکھیارا شہزادہ

سلطان محمد کے بیٹے جم کی داستان مصیبت۔ قیمت تین آنے

اتاترک

مصطفٰے کمال پاشا کی زندگی کے حالات۔ قیمت تین آنے

بچوں کے گیت

حسرت صاحب کی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ بچوں کی آسان زبان میں۔ قیمت تین آنے

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل ریلوے روڈ لاہور

پیام اقبال

یہ باشندگان ہند کی خوش قسمتی ہے کہ آج مشرق کے سب سے بڑے حکیم اور مدبر شاعر کے حیات افروز کلام پر سب سے پہلی اور سب سے جامع و مانع چیز پیام اقبال کے نام سے موسوم ہو کر شائع ہو گئی ہے۔ طارق صاحب نے سالہا سال کے مسلسل اور دقیق مطالعہ کے بعد اقبال کے کلام کو تقریباً سولہ عنوانات پر تقسیم کرتے ہوئے شاعر کے اہم ترین مقاصد کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فہرست ملاحظہ ہو:

۱۔ شان توحید 2۔ نفسیات خودی 3۔ خودی اور تکبر میں فرق 4۔ مضرات خودی 5۔ حدیث دل 6۔ معراج روح 7۔ بقائے آرزو 8۔ فلسفہ ہجر 9۔ مناظرہ عقل و عشق 10۔ دعوت عمل یا فلسفہ سخت کوشی 11۔ موانع عمل 12۔ اخوت اسلامیہ 13۔ وطنیت 14۔ مساوات 15۔ تہذیب حاضر 16۔ حقیقت موت و حیات صفحات تقریباً 300 ۔ قیمت مجلد سنہری تین روپے

تاج کمپنی لمیٹڈ۔ قرآن منزل ریلوے روڈ۔ لاہور

The End ---------------------- اختتام